

مثالی سیرتیں

مثالی سیرتیں

مصنفہ

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی
(ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مترجمہ

ادیبہ بنت زہرا نقوی ندی الہندی

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن

حسینیہ غفران مآب، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳ (ہندوستان)

بنت زہرا نقوی ندی الہندی

Misali Seerate'n

By

Professor Allama Sayed
Ali Muhammad Naqavi

Translated By

Binte Zahra Naqavi Nadal Hindi

Publisher

Noor-e-Hidayat Foundation

Imambara Ghufraanmaab, Maulana Kalbe Husain Road,
Chowk, Lucknow-226003 (INDIA)

Website : www.noorehidayatfoundation.org





مثالی سیرتیں

مصنفہ

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی
(ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مترجمہ

ادیبہ بنت زہرا نقوی ندکی الہندی

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن

امام باڑہ غفران مآب، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ۔ ۳/۱۸ انڈیا

مثالی سیرتیں

نام کتاب	:	مثالی سیرتیں
مصنف	:	پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی
مترجمہ	:	ادیبہ بنت زہرا نقوی ندکی الہندی
ناشر	:	نور ہدایت فاؤنڈیشن، لکھنؤ
کمپوزنگ	:	جاسکی کمپیوٹر پوائنٹ (08736009814)
سرورق	:	ایڈورٹائزرس انڈیا، گولڈنگ لکھنؤ
سنہ اشاعت	:	یکم جنوری ۲۰۱۶ء
تعداد	:	ایک ہزار
ہدیہ	:	۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

۱۔ امامیہ مشن، آرام گاہ سید العلماء، امام باڑہ جنت مآب، سید العلماء روڈ، اکبری گیٹ، لکھنؤ

۲۔ نور ہدایت فاؤنڈیشن امام باڑہ غفران مآب، چوک، لکھنؤ۔ ۳ (یو۔ پی۔)
فون: 0522-2252230 موبائل: 9335996808 — 8736009814

۳۔ امامیہ مشن، امامیہ ہال، نیشنل کالونی، امیر نشان علی گڑھ (یو۔ پی۔)

Website: www.noorehidayatfoundation.org

Email: noorehidayat@gmail.com

فہرست

۱۴	عرض نور
۱۵	سبحان اللہ
۱۹	میری سنو!
۲۱	پیش لفظ
۲۳	انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے
۲۶	(۱) پیغمبروں کی دوہری حیثیت
۲۸	(۲) انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے
۲۹	حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ: ایک زندہ جاوید نمونہ عمل
۳۳	پیغمبرؐ کی تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے
۳۴	حضرت فاطمہؑ کا اسوۂ جاوید
۳۹	جناب فاطمہؑ زہراؑ: اسلام میں عورت کے بلند مقام کا مظہر
۴۴	امامت و ولایت: ابعاد (Dimensions) اور مضامین
۴۴	نبوت و امامت میں تعلق
۴۶	امامت اور ولایت کی ضرورت
۴۹	ائمہ علیہ السلام کی خصوصیتیں
۴۹	(۱) عصمت
۵۰	(۲) علم و ہی
۵۱	(۳) بشری پہلو

۵۱	پیغمبر، امام اور نوابغ میں فرق
۵۲	رسالت، امامت اور ولایت کا کردار
۵۲	معاشرہ کی رہبری
۵۳	اسلامی حقائق و معارف کا بیان اور تحفظ
۵۴	(ج) امامت کی باطنی رہنمائی
۵۵	کیوں ”امام“ یا ”ولی“ سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہنا چاہئے؟
۵۶	زمانہ غیبت میں ولایت امامت
۵۷	نقلی دلیلیں
۵۹	ولایت فقیہ کا فلسفہ
۶۱	حیاتِ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام
۶۱	۱۔ حضرت علیؑ: ایک ہمہ جہت (Multidimensional/بہتमुखी) شخصیت
۶۳	۲۔ حضرت علیؑ کے ادوار زندگی کی تقسیم
۶۴	پہلا دور علیؑ پیغمبرؐ کے ساتھ
۶۴	علیؑ نے اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت حاصل کی
۶۷	دعوت ذوالعشیرہ
۷۰	واقعہ ہجرت پر ایک تحقیق
۷۱	علیؑ: پیغمبرؐ کے معنوی بھائی
۷۲	۲۔ ہجری
۷۳	۳۔ ہجری کی جھلکیاں
۷۴	۵۔ ہجری کے واقعات پر ایک نظر
۷۵	صلح حدیبیہ

۱۲۳	۶۔ عائد (عائد) بن مجمع
۱۲۳	۷۔ جنادہ ابن حارث سلمانی
۱۲۳	۸۔ جندب ابن جحیر کندی خولانی
۱۲۳	۹۔ دہم ابن امیہ عبدی بصری
۱۲۴	۱۰۔ امیہ ابن سعد ابن زید طائی
۱۲۴	۱۱۔ جابر ابن حجاج
۱۲۴	۱۲۔ جبلة بن علی شیبانی
۱۲۴	۱۳۔ جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی
۱۲۴	۱۴۔ جو بن (جوین) ابن مالک ابن قیس بن ثعلبة تیمی
۱۲۵	۱۵۔ حارث ابن امراء القیس ابن عابس کندی
۱۲۵	۱۶۔ حارث بن نبهان (نبهان)
۱۲۵	۱۷۔ حباب ابن حارث
۱۲۵	۱۸۔ حباب ابن عامر ابن کعب تیمی
۱۲۵	۱۹۔ حبشہ بن قیس النہی
۱۲۵	۲۰۔ حجاج ابن زید سعدی تیمی
۱۲۶	۲۱۔ حلاس بن عمرو ازدی راسبی
۱۲۶	۲۲۔ حنظلہ ابن عمر (عمرو) شیبانی
۱۲۶	۲۳۔ زہیر بن عمرو سلمی کندی
۱۲۶	۲۴۔ زہیر ابن بشر شعمی
۱۲۶	۲۵۔ زہیر ابن سلیم ابن عمرو ازدی
۱۲۶	۲۶۔ سالم غلام عامر ابن مسلم العبدی

۱۲۶	۲۷۔ سلیم
۱۲۷	۲۸۔ سوار ابن ابی عمیر نہی
۱۲۷	۲۹۔ سیف ابن مالک عبدی
۱۲۷	۳۰۔ شیبب ابن عبد اللہ
۱۲۷	۳۱۔ شیب (شیبب) ابن عبد اللہ نہشلی
۱۲۷	۳۲۔ ضرغامہ ابن مالک تغلبی
۱۲۷	۳۳۔ عامر ابن مسلم عبدی بصری
۱۲۷	۳۴۔ عباد ابن مہاجر ابن ابی المہاجر جہنی
۱۲۷	۳۵۔ عبد الرحمن ابن عبد رب انصاری خزرجی
۱۲۸	۳۶۔ عبد الرحمن ابن عبد اللہ بن کدن ارجبی
۱۲۸	۳۷۔ عبد الرحمن ابن مسعود
۱۲۸	۳۸۔ عبد اللہ ابن بشر شعمی
۱۲۸	۳۹۔ عبد اللہ ابن یزید ابن شیبب (شبیط) قیسی
۱۲۸	۴۰۔ عبید اللہ ابن یزید ابن شیبب (شبیط) قیسی
۱۲۸	۴۱۔ عقبہ ابن صلت جہنی
۱۲۸	۴۲۔ عمار ابن ابی سلامہ دالالی (دالانی)
۱۲۹	۴۳۔ عمار ابن حسان طائی
۱۲۹	۴۴۔ عمرو ابن ضبیعہ بن قیس ابن ثعلبة تیمی
۱۲۹	۴۵۔ عمران ابن کعب ابن حارث اشعمی
۱۲۹	۴۶۔ قارب غلام حسین
۱۲۹	۴۷۔ قاسط ابن زہیر ابن حارث تغلبی

۱۵۹	امام محمد باقرؑ اور اشاعت دین
۱۶۱	امام محمد باقرؑ کے زمانے کے حالات
۱۶۳	گھٹن کے دور میں امامؑ کی حکمت عملی
۱۶۵	نسبتاً آزادی کے دور میں امامؑ کی حکمت عملی
۱۶۸	امام جعفر صادق علیہ السلام
۱۶۸	”پیغام“ کو ”نظام“ میں ڈھالنے والے
۱۷۳	امام جعفر صادقؑ کے عظیم کارنامے
۱۷۹	امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام
۱۷۹	ظلم و جور سے معرکہ کے علمبردار
۱۸۰	امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی اور مفہوم و ایجاد امامت
۱۸۱	امام کا وہی علم
۱۸۲	امامؑ کی سیاسی رہبری
۱۸۴	امامؑ کی علمی و فکری رہبری
۱۸۵	امامؑ کی روحانی منزلت
۱۸۷	امام رضا علیہ السلام
۱۸۷	مامون کی سیاست کا تجزیہ — امام رضاؑ اور ان کا طریقہ کار
۱۸۷	مامون کی چال
۱۹۰	مامون کا مقصد
۱۹۰	’طاقت‘ کو ’اقتدار‘ میں اور ’فرمان‘ کو ’شرع‘ میں بدلنا
۱۹۱	دوسرا مقصد — عوام کی نظر میں حکومت کی ’ساکھ‘ کو بدلنا
۱۹۲	تیسرا مقصد — ابھرتی ہوئی شیعہ تحریک کو دبانا

۱۹۳	چوتھا مقصد — امامؑ کی شخصیت کو توڑنا □
۱۹۴	پانچواں مقصد
۱۹۴	داخلی دشمنوں کے خلاف اقتدار کی جنگ میں شیعہ طاقت کا استعمال
۱۹۴	چھٹا مقصد — خراسان کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنا
۱۹۵	شہادت امام رضاؑ — مامون کی اسٹریٹیجی کی ناکامی
۱۹۵	امام رضاؑ کی حکمت عملی
۲۰۰	امام محمد تقی علیہ السلام
۲۰۰	تاجدار تقویٰ
۲۰۰	ایک شبہ کا جواب
۲۰۱	اُس زمانے کے سیاسی حالات
۲۰۴	امام جوادؑ کے مقابلے میں مامون کی تکنیکی چال
۲۰۶	امام علی نقی علیہ السلام
۲۰۶	متوکل سے مقابلہ کے سو رما
۲۱۰	حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام
۲۱۰	کی حیات اور ان کے کارہائے نمایاں پر ایک نظر
۲۱۰	زمانہ امام کے سیاسی حالات
۲۱۲	اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں امامؑ کا کردار
۲۱۳	امام کے بعض مشہور تلامذہ
۲۱۶	امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف
۲۱۶	امام زمانہؑ اور عقیدہ مہدویت
۲۱۷	غیبت کے دور میں امام کون سا کردار ادا کر رہے ہیں؟

۲۱۸	فلسفہ غیبت
۲۲۱	تاریخ ترجمہ 'اسوہ ہائی جاوید'



بسمہ سبحانہ

عرض نور

الحمد لله الذی هدانا لهذا ما کنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله۔

اس ایک پالنے والے کی حمد و ثنا جس نے انسان کو احسن تقویم بنایا اور عقل و تمیز سے نواز کر اسے ارادہ و اختیار کی (ایک حد تک) آزادی عطا کی پھر یونہی چھوڑ نہیں دیا، نور ہدایت سے راستہ بھی دکھا دیا، وہ بھی بسر و علن، ظاہر و باطن سے، ملفوظی و مکتوبی طور سے اور اول سے آخر تک۔ اس کا شکر کیسے ادا کر سکتے جس نے رہرو سے پہلے رہنما خلق کیا اور رہنمائی کے سلسلہ کو باقی بھی رکھا۔ اس سلسلہ ہدایت کو شاہکار تخلیق فخر موجودات ہستیوں تک پہنچایا اور انہیں کو ہمارے لئے فکر و عمل کا نمونہ قرار دیا۔ ان مثالی شخصیتوں کے کردار کو ہمارے دل و دماغ، فکر و نظر اور زبان و قلم اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں سمجھنے اور (دنیا کو) سمجھانے کی سعی کرتے آئے ہیں۔ اس تسلسل میں نور ہدایت فاؤنڈیشن، بھی 'انوار معصومین، منظر عام پر لانے کے بعد اپنی پیش کش کے طور پر اب 'مثالی سیرتیں' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یہ کتاب دراصل پروفیسر (ڈاکٹر مولانا) سید علی محمد صاحب نقوی دام عزہ کی ایک علمی تحقیقی تجزیاتی کاوش کا اردو ترجمہ ہے جو محترمہ سیدہ بنت زہراندی الہندی کی قلمی سعی کا نتیجہ ہے۔

امید ہے ہمارے محترم باذوق قارئین اس کی خاطر خواہ پذیرائی فرمائیں گے جو ہماری حوصلہ افزائی کا سبب ہوگی۔

خاک پائے در آل نبیؐ

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جاسی

نور ہدایت فاؤنڈیشن

لکھنؤ

موبائل: 8736009814

بسمہ سبحانہ

سبحان اللہ

قلم آج ان کی جیہ بول

اندھا چکاچوندھ کا مارا کیا جانے اتھاس بیچارہ
ساکشی ان کی مہما کے ہیں سور یہ چندر بھوگول کھگول

قلم آج ان کی جیہ بول

[قلم آج اٹھا ان کا نشان کہ گونجے 'زندہ باد' سے جہاں
اندھی چکاچوندھ کی ماری کیا جانے تاریخ بیچاری
شاہد ان کی عظمت کے ہیں سورج چاند زمیں آسماں
قلم آج اٹھا ان کا نشان کہ گونجے 'زندہ باد' سے جہاں]

ہندی کے شاعر کو بڑے دور کی سوچھی۔ تاریخ انسانی کے بڑے بنیادی راز کا درک کر لیا۔ ظاہر ہے، سامراج کے بناوٹی تزک بھڑک اور بنوٹ کی چکاچوندھ میں اندھیر ماری 'بندھو' تاریخ ان عظمتوں کی کہکشانوں کو دیکھنے کی اقبالی 'مجرم' کہاں ہو سکتی جو تاریخ کے فوکس میں آنے کی بنیادی اہلیت سے بھی عاری ہوں؟ ان میں نہ تخت کی ہتک ہو، نہ محل کی مہک ہو، نہ دربار کی بھنک ہو اور نہ ہی بغاوت و شورش کی دھمک۔ اپنی اس قطعی پیدائش روش کے باوجود تاریخ چاہے انچاہے، ایک سلسلہ کردار سے (جو موجودہ تالیف کا موضوع ہے) صرف نظر نہ کر سکی۔ اس پر طرہ یہ کہ تاریخ کے 'آقا' اس سلسلہ کے کرداروں سے، نہ جانے کیوں، بہ سروعلن خاصمانہ و معاندانہ مخالفت پالے رہے۔ یعنی اپنے بھر تاریخ کا فوکس ان کی مخالف سمت ہی چاہتے رہے ہوں گے۔ (یہی نہیں حدوں کو پار کرتی ہوئی مخالفت ان کے اجلے دامن کردار پر کسی میل کا کوئی ہلکا سا چھینٹا کہنے کو بھی نہ لگا سکی۔) یہ سب کیا تھا؟ کوئی سچ تھا جو سرچڑھ کر بولتا رہا، یا اس سلسلہ کے غیر معمولی کمالات کی

بلاخیز تابانی تھی جو آنکھوں دکھاتے سامراج اور اندھی اپانج (کی گئی) تاریخ لگی آنکھوں میں ساقی رہی، یا کوئی قدرتی فطری انتظام تھا جو تاریخی روش کو دھتکا دکھا تار ہایا پھر کوئی روحانی اعجازی عصا تھا جو تاریخ اور سامراج کے سامری سانپوں کو نگلتا رہا۔

بارہ تیرہ پشتوں کی چودہ ہستیوں کا یہ سلسلہ کوئی تین صدیوں پر محیط اور مسلسل جلوہ فرار ہا، پھر بھی اس میں کردار کی پوری پوری یکسانیت، یگانگت اور یک رنگی ہی نہیں وحدت کردار نمایاں رہی۔ یہ وحدت کردار کمال و معراج انسانیت کو سمیٹے ایک اصول و ضابطہ کی جامع جولان گاہ، ایک فکر و نظر (نظریہ یا عقیدہ کہہ لیجئے) کی بھرپور ٹپک (Typical) کار گاہ بنی رہی۔ دوسرے لفظوں میں یہ وحدت اصول و عمل، ضابطہ و اقدام کا ہم آہنگ نکتہ اتحاد ثابت ہوئی۔

اس اصولی سلسلہ کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی 'تاریخیت' بھی ہے۔ دنیا کے سماجی اخلاقی نظریات اپنے نمونہ عمل دینے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ادھر اکثر و بیشتر (اور قریب قریب سبھی بڑے) مذاہب کے دینی 'نمونے' تاریخی اور انسانی کردار سے عاری ملتے ہیں۔ مہاتما بدھ، شری کرشن، جناب موسیٰ اور حضرت عیسیٰ مسیح جیسے مذہبی سربراہوں، بانیان مذاہب کی ہستیاں ضرور تاریخی ہیں لیکن ان کی حیات، کردار، شخصیتیں ماورائے تاریخ ہی رہیں۔ لیکن مذکورہ سلسلہ کی جتنی بھی ہستیاں ہیں، وہ سارے ناسازگار ماحول کے باوجود نہ صرف تاریخ کا جزو بن کر رہیں بلکہ ماورائے عقل، اساطیری (Mythological) دنیا کے ہوائی پیکر یا 'ہوا' بھی نہ بننے پائیں۔ یہ الگ بات ہے، تاریخی ستم ظریفی کہہ لیجئے یا تاریخ انسانیت کی بدبختی کہ ان کی جزوی عکاسی کے سوا تمام و کمال عکس بندی تاریخ کو نصیب نہ ہو سکی، لیکن اسی جزوی عکس بندی کی معقول توسیعی تعبیر (Extrapolation) سے ایک حد تک مکمل تصویر ابھارنا محال نہیں ہے۔

اس سلسلہ کی کسی ہستی یا مختلف ہستیوں کے بظاہر مختلف رویے ضرور دیکھے یا سمجھے جاسکتے ہیں لیکن وہ وحدت کردار پر کوئی سوالیہ نشان نہیں بن سکتے۔ مجموعی طور سے اس سلسلہ پر کچھ غائرانہ نظر سے ہی یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ یہ بظاہر مختلف رویے اختلاف کردار کا آئینہ نہیں بلکہ مختلف

حالات اور مختلف ماحول سے معاملات (Interactions) کا نتیجہ ہیں جن کے پیچھے ایک ہی اصول و قاعدہ، عدل و اعتدال کا رفر مارہا۔

یہ سلسلہ کردار بمعنی جامعیت، پراثر جاذبیت اور پر جہات ابلاغیت (Communicativity) سے بھی خاص ہے اور اتنا کہ مختلف ذہنوں نے اس کی بے ساختہ مجدد و بانہ جبہ سائی کی۔ مختلف ذہنیتوں نے اسے اپنے انداز میں پڑھا، سمجھا اور سمجھایا، اور اس میں اپنے اپنے نکتہ نظر کی تسکین کا سامان پایا۔ اس سلسلہ میں مذہب نے اپنا قائد و امام دیکھا، دانشوری کو مسیحا ملا، فلسفہ و حکمت کو پناہ ملی، منطق کو اسی میں بول ملا، روحانیت و تصوف نے اس میں اپنا منتہا تلاش کیا۔ اخلاق کو یہاں معراج انسانیت دکھی۔ راہ عشق نے یہیں منزل مودت پائی۔ خودی کی بلندی نے یہاں 'رضا' پائی۔ یہاں آکر عقل کی بن آئی (نہیں تو احمقوں کی جنت میں عقل کو کون پوچھے؟) اسی سلسلہ کے زیر سایہ فلسفہ نے سائنس کی طرف انقلابی جست لگائی۔

اس سلسلہ کو سمجھنے سمجھانے کے ضمن میں حالیہ برسوں میں ایک قابل قدر نگارش 'اسوہ ہائے جاوید' نگرش تحلیلی پیرامون 'سیرۃ ائمہ' منے آئی ہے۔ فارسی زبان کی یہ نگارش اصلاً عقائد کے مقدس ٹیکسٹوں سے اس سلسلہ کو دیکھنے کی ایک فاضلانہ تحقیقی و تجزیاتی کاوش ہے۔ نامور عالم و دانشور، محقق و فاضل، معلم و مصنف پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید علی محمد نقوی کا یہ قلمی شاہکار انتشارات واحد، فرہنگی بنیاد شہید انقلاب اسلامی، ایران کی ۱۳۶۲ھ (۱۹۸۳-۸۴ء) کی اشاعت ہے۔ فاضل مولف کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ لکھنؤ کے شہرہ آفاق علمی خانوادہ خاندان اجتہاد سے تعلق رکھنے والے اور دور حاضر کی نابغہ روزگار ہشت پہلو ہستی، سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ کے چشم چراغ ہی نہیں ان کی علمی، تعلیمی، تحقیقی و قلمی مسند کے رونق افروز جانشین (باحسن وجہ خلف صالح) ہیں۔ اپنی نسی و نسبتی خصوصیات کے ساتھ بذات خود انفرادیت کی چھاپ چھوڑ چکے ہیں اور یگانہ و بیگانہ کے مدح ہو چکے ہیں۔ اسلامی عمرانیات (Islamic Sociology) اور اسلامی عرفانیات و تصوف کے اس اختصاصی فاضل کی فارسی اور انگریزی کی قلمی مساعی دنیائے

کمال سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مذکورہ فارسی نگارش کی اردو جامعہ زمینی ادیبہ و فاضلہ، عزیزہ و معززہ، خطیبہ و معلمہ سیدہ بنت زہرا نقویہ ندکی الہندی کی سعی مشکور ہے۔ (پردہ دار) فاضلہ مترجمہ کی ادبی شخصیت بہر صورت مستور نہیں، جلوہ مقدور ہے۔ عصری اردو جرائد میں شائع ہونے والی موصوفہ کی شعری و نثری تخلیقات اپنی زبان میں کہتی ہیں۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ترجمہ کا مہم جو یا نہ حوصلہ لائق داد ہے۔ ترجمہ خود اپنے میں نازک ترین صنف ہوتا ہے جہاں نہ جانے کتنی ہی تخلیقی قوتیں شہید ناز ہو جایا کرتی ہیں۔ پھر ترجمہ کا یہ ناز میں خوں، قلم صنف نازک کے ہاتھ جو لگ جائے تو کمال آزمائش مہندی کیا رنگ دکھائے اور خانہ برانداز چمن کس کس طرف اور کیا کیا گل و شمر پھیلے!! کچھ بھی ہو، کسی گل و شمر میں کسی ترجمہ نگار کو اپنے لئے از قسم قدر و تحسین کچھ نہ دیکھنا چاہئے۔ اسے تو نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا کا واقعی بے نیاز پیکر ہونا چاہئے کیونکہ اسے کھوکھلی قدردانی کے سوا کچھ نصیب ہو ہی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والی ناواقفیت کے شوق تجسس سے کچھ ہمت افزائی مل جائے تو بہت ہے۔ ترجمہ کا قاری لباس مجاز ہی کو سجدہ کر لیتا ہے اور لباس مجاز میں آنا حقیقت کی شان نہیں۔ جس کی پہنچ جلوہ حقیقت کے طور تک ہوتی ہے، وہ اسی کی برق تجلی سے غش کھا جاتا ہے، ترجمہ کے مجاز کو کیوں اور کیسے دیکھنے لگا۔ ترجمہ تو حقیقت کی لا حاصل ترجمانی کے چکر میں مجاز کے 'اصلی' حسن سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ پھر بھی مترجمہ موصوفہ کو دل تھوڑا نہ کرنا چاہئے کیونکہ بخت رسا سے انہیں ہمسفر حیات کی صورت میں لطیف و ظریف ہم صغیر ایسا ملا ہے جو مذکورہ ترجمہ کے حوالہ سے 'طور رسا' بھی ہے اور 'مجاز آشنا' بھی، یعنی ترجمہ کے لئے حرف تحسین تخلیق کرنے کی بنیادی اہلیت رکھتا ہے۔ امید قوی ہے کہ وہ اپنے عالمی فرائض کے ساتھ اس استجاب کو بھی (کم از کم ہپاس خاطر اہلیہ) بعد اہلیت اپنی فطری ظریفانہ خوش اسلوبی سے ادا بھی کر دیں گے۔ فقط والسلام

فضول کی اپنی اس باصرہ خراشی کے لئے شرمندگی اور معافی کا پیکر۔

لکھنؤ

م۔ر۔عابد

تک اصل کتاب کے ترجمہ ہی کی حیثیت سے ابلاغ و ترسیل کا کام انجام دیکر سید العلماء کی دونوں کتابوں اور علامہ موصوف کی اصل کتاب کے سائے میں مفید ثابت ہو سکے۔

علامہ سید علی محمد نقوی کی ایک کتاب ”پانچ کر نیں“ اردو میں ہے جو آپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں لکھی ہے۔ خمسہ نجبا یعنی پنجتن پاک کا تذکرہ ہے، جو زبان و بیان، معانی و مطالب اور تفہیم و تبلیغ کے اعتبار سے بڑی کامیاب کتاب ہے اور جس سے موصوف کی بلندی فکر اور علوئے علم کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس کے علاوہ ہندوستانی عہد طالب علمی کے بہت سے معرکۃ الآرا مقالے ہندوستانی موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے جنہیں بعد میں ماہنامہ ”شعاعِ عمل“ میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع کیا تھا۔ مذکورہ عہد ہی میں موصوف کے مذہب و ادب کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی ابتدائی، بنیادی، کتابچے شائع ہوئے ہیں جو ان علوم کی تسہیل کے لئے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

علامہ موصوف کے دوسرے تصنیفات فارسی، انگریزی اور دیگر اہم زبانوں میں شائع ہو کر ایران، ہندوستان اور دیگر ممالک میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

قرآن شناسی کے تحت بالکل نئے انداز کے انگریزی اور اردو زبانوں میں ترجمہ و تفسیر کا سلسلہ جاری ہے جس کی دو جلدیں انگریزی میں چھپ چکی ہیں جسے مع مقدمہ تفسیر اکتیس جلدوں میں منظر عام پر آنا ہے۔ خیر اپنا یہ تحریری کام قارئین کے سامنے ہے جسے میں اپنے لئے ذخیرہ آخرت سمجھتی ہوں۔ میں ممنون و تشکر ہوں مصنف علام، م۔ر۔ عابد صاحب، اپنے شوہر عابد رنیز کارکنان نور ہدایت فاؤنڈیشن جن کی علمی و عملی مدد کے سبب یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

فقط والسلام

بنت زہرا نقوی ندی الہندی

حسین آباد، لکھنؤ

۳۰ مارچ ۲۰۱۱ء

میری سنو! -----

میرے شوہر مولانا سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیف جاسی کا مجھ سے اصرار رہا کہ میں علامہ سید علی محمد نقوی کی مشہور کتاب ”اسوہ ہائے جاوید“ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروں۔ کچھ دنوں تک تو ہمت نہ پڑی لیکن آخر کار ہمسر، ہمسفر بلکہ شریک حیات کے قول ساتھ ہی موصوف کے علامہ نقوی سے قول و قرار کا احترام کرتے ہوئے قلم کو اٹھانا ہی پڑا۔ اس تحریری سفر میں جن مشکلات کا سامنا پڑا انہیں لکھنا صرف اور صرف اطناب کو شہ دینا اور حسن ایجاز کو مجروح کرنا ہوگا۔ البتہ یہ لکھنا جذبہ احسان شناسی کے تحت واجب ہے کہ اگر میرے شوہر اور سب سے اہم (محقق گرامی ادیب العصر) م۔ر۔ عابد کے حق نما، حقیقت نگر اور حقائق نگار قلام تصحیح کا کام نہ انجام دیتے تو یقیناً یہ ترجمہ منظر عام پر نہ آتا اور اسی لئے آج نہیں بلکہ میرے لئے ہمیشہ ہی یہ افراد اپنے صحیحی تعاون و مشورت یعنی سعی جمیل کے سبب مشکور رہیں گے۔

ترجمہ نگاری میں میں کہاں تک کامیاب ہوئی اس کا فیصلہ اہل نقد و نظر کریں گے البتہ معصومین علیہم السلام کی سوانح کو اردو میں پیش کر کے میں کافی مسرور و مطمئن ہوں کہ کچھ اپنی محنت کے سبب ثواب وہاں کے لئے ذخیرہ کر چکی ہوں اور اب کچھ نہ کچھ قاریان کتاب کی قرأت کے سبب مزید مشابہ ہو جاؤں گی۔

اصل کتاب کی معنوی و ادبی عظمت سے میں خود بخوبی آگاہ نہیں ہوں ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اگر مصنف موصوف اس کتاب کو اردو میں لکھتے تو یہ کتاب بھی آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی رحمہ اللہ کی لاثانی کتابوں یعنی ”رہنمایان اسلام“ اور ”معراج انسانیت“ کی طرح امتیازی شان کی ہوتی جس کا ترجمہ سے بھی کافی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو زبان میں سید العلماء کی مذکورہ کتابیں اپنی مثال آپ ہیں کاش یہ کتاب بھی کسی حد

پیش لفظ

اسلام دوسرے مذاہب کے برخلاف صرف مذہبی رسومات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ انسان کی دنیاوی اور مذہبی کامیابی کا جامع نظام ہے اور انسان کی معنوی، روحانی، اخلاقی اور سماجی کامیابی کے طریقے بتلاتا ہے۔ اسلام صرف Theory نہیں پیش کرتا جو صرف کتاب خانوں اور فلسفیوں کے کام آئے بلکہ عملی نمونے اور زندہ سیرتیں سامنے لاتا ہے تاکہ وہ اپنے کردار اور گفتار سے اسلام کو پیش کریں۔

جناب پیغمبر خدا اسلامی تعلیمات کی زندہ مثال اور نمونہ تھے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ پیغمبرؐ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی زندگی میں ان تمام حالات کا سامنا کرنے کا طریقہ بتائیں جو آئندہ صدیوں میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔ لہذا یہ بے حد ضروری اور اہم تھا دوسری زندہ سیرتیں موجود ہوں جو مختلف حالات و شرائط سے دوچار ہوں اور عملاً مسلمانوں کو یہ بتلائیں مسلمانوں اور مومنین کو ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔

اسی لئے ہمارا ہر امامؑ ایک خاص ماحول میں رہا۔ کسی نے صلح کی، کسی نے جنگ کی، کسی نے معارف اسلامی کی عظیم یونیورسٹی قائم کی، کسی نے دعا کے ذریعے اپنے مشن کو آگے بڑھایا، کسی کو تخت سلطنت پیش کیا گیا اور کسی کی ساری عمر قید خانے میں بسر ہوئی۔ اسلام نے خواتین کے لئے بھی زندہ سیرتیں پیش کی ہیں۔

ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم حالات کے تقاضے اور امام معصوم کے کردار کو سمجھیں کہ اس کے بغیر ہم شیعہ کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔ یہ بہت اہم ہے کہ ہم یہ جانیں کہ کن حالات میں امام نے کس حکمت عملی کو اپنایا۔ ائمہ معصومین کی سیرت کا مطالعہ صرف شیعوں کے لئے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے۔ کیونکہ ائمہؑ کی جدوجہد اور کوشش و جہاد

اسلامی بنیادوں کے تحفظ کے لئے تھی۔ □

عالمی سطح پر اسلامی وحدت کے قائم ہونے کے لئے ضروری ہے اسلام کے مختلف فرقے ایک دوسرے کی تاریخ سے واقف ہوں تاکہ نفرت اور بدگمانی کی فضا ختم ہو سکے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ابتدائی صدیوں میں جو واقعات رونما ہوئے اور وہ مقاصد جن کے لئے شیعوں نے دجلہ اور فرات کو اپنے خون سے رنگین کیا، وہ کسی خاص فرقے سے متعلق نہیں تھے بلکہ یہ ٹکراؤ دربار سلطنت اور محمدؐ علیؑ کے ماننے والوں کے مابین ٹکراؤ تھا۔

پچھلے کچھ برسوں سے پوری دنیا میں ہمارے ائمہؑ کی سیرت کے مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن یہ لوگ جو کچھ جانتے ہیں وہ سب غیر شیعہ مآخذ سے ہے اور ظاہر ہے کہ نادرست واقعات اور تجزیہ و تحلیل سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف ان لوگوں کی تحقیقات ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت ہوتی ہیں اور زیادہ تر استعماری طاقتوں کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لہذا لازم ہے کہ اپنے محققین اس سلسلے میں بحث و مباحثہ کریں اور کتابیں لکھیں۔ لیکن چند محدود کتابوں کے علاوہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر امامؑ کے حالات زندگی پر مبنی ہے، نہ کہ ان کے کردار و سیرت کی تفسیری و تحلیلی جائزہ پر۔ اس کتاب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ واقعات کے بیان سے پرہیز کریں اور صرف واقعات کا تجزیہ و تحلیل پیش کریں۔ یہ ابتدائی قدم ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ہمارے بڑے محققین اپنی محنت کو کتابی شکل میں پیش کریں گے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ائمہؑ کی سیرت ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک فکر بشری نہیں پہنچ سکتی اور یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ چند صفحے میں امامؑ کی سیرت اور کردار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

والی اللہ التفویض وعلیہ التکلیل

علی محمد نقوی

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۰۳ھ

مطابق ۸ فروردین ۱۳۶۲ھ

اور ”ہر جہت سے واجب الوجود“ ہے، لہذا وہ صحیح معنوں میں فیاض علی الاطلاق ہے۔ تمام موجودات اور اشیاء، جہاں تک ان کے لئے لازم ہے، کرم و عنایت کرتا ہے اور ان کو ان کے کمال کے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔^(۲) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: {قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى} (طہ: ۵۰)

”خدا نے تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اپنی تمام مخلوق پر جو اس کی حلقہ بگوش تھیں اس نے عنایت کی اور اپنی بتائی ہوئی راہ کی ہدایت کی“۔ نبوت اور رسالت اس خدائی ہدایت کے سلسلے کی سب سے کامل اور اعلیٰ کڑی ہے۔ انسان کو ایسی ہدایت کی ضرورت ہے جو روزمرہ کی مبتذل زندگی سے ماوراءِ افق تک اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس کے علاوہ وہ دنیوی زندگی کی تنظیم کے لئے ایک مکمل اور جامع نظریہ اور نظام کا بھی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ اصل تفضل و عنایت کی بنیاد پر اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتا، نہ اس کی پیاس کو بجھائے بغیر چھوڑ سکتا ہے۔

قانون اور طرزِ حیات کی انسانی ضرورت بھی جو انسانی سماج کی سعادت کی ضمانت ہے، بغیر بیرونی امداد کے پوری نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ قانون کو اس طرح ہونا چاہئے کہ انسانی وجود کے تمام زاویوں اور پہلوؤں پر نظر رکھ کر بنایا گیا ہو اور تمام اقوام کی تہذیب زبان اور عادات و اطوار پر یکساں نگاہ غائر ہو۔ انسان بذاتِ خود اپنی عقل و فہم کے بل بوتے پر ایسے نظریہ مرتب نہیں کر سکتا کیونکہ کسی بھی بشری قانون ساز کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے کما حقہ آگاہ ہو۔ اگر وہ بہتوں کے نزدیک ہوگا تو بہتوں سے دور بھی ہوگا۔ نتیجتاً اگر وہ نزدیک کے لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے واقف ہوگا تو دور کے لوگوں کے حالات اور مسائل سے ناواقف ہوگا۔ صرف خالق کائنات ہی کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جو تمام موجودات سے یکساں قرب رکھتی ہے اور علیم و بصیر ہے۔ لہذا صرف خداوند تعالیٰ ہی ایسا قانون مقرر کر سکتا ہے جو عالم انسانیت کے لئے یکساں سودمند ہو۔ اس لئے انسانی سعادت کے

(۲) متکلمین و فلاسفہ کے نظریات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ”شیعہ در اسلام از علامہ طباطبائی اور وحی و نبوت از استاد مطہری

لئے انبیاء کا مبعوث ہونا ناگزیر ہے۔

لیکن جس طرح بارش اس شرط پر زمین کو بار آور کرتی ہے کہ وہ بخر نہ ہو اور ظرفیت رکھتی ہو۔ گلستان میں پھول کھلتے ہیں لیکن کیچڑ میں صرف اضافہ ہوتا ہے۔ بارش پودوں کو سرسبز کرتی ہے لیکن درختوں کے زرد پتوں کو پایمال ہونے کے لئے پھینک دیتی ہے، اسی طرح وہی لوگ ارشاد پیغمبری سے مستفیض ہوتے ہیں جن کے پاس زندہ ضمیر اور ظرفیت ہو۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کے دل و دماغ و فکر و احساس پر قرآن کی اصطلاح میں مہر لگ چکی ہے اور جو جانوروں سے بھی بدتر ہیں نہ صرف ہدایت انبیا سے مستفیض نہیں ہوتے بلکہ ان کی شقاوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ پیغمبروں کے مقابلہ میں مورچہ بناتے ہیں اور ایسے لوگ بد نصیبی کے علاوہ کچھ نہیں پاتے۔

(۱) پیغمبروں کی دوہری حیثیت

پیغمبر دوہری حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کا تعلق خالق حقیقی سے ہوتا ہے تو دوسری طرف خلقِ خدا سے۔ یہ دو طرفہ رابطہ نبوت کی خاص صفت ہے۔ لفظ ”نبی“ عربی میں خبر لانے والے کو کہتے ہیں اور فارسی میں لفظ ”پیامبر“ بھی یہی معنی رکھتا ہے، عربی میں لفظ ”رسول“ کے معنی ہیں بھیجا ہوا۔ چنانچہ یہ تمام الفاظ رسول کی دوہری حیثیت کے مظہر ہیں۔ پیغمبر خدا و خلق کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ پیغمبروں کا یہی دوہرا رابطہ انہیں دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔

پیغمبر ایک انسان ہوتا ہے، لیکن الوہی انسان۔ ایسا انسان ہے جسے خدا نے اپنا رسول منتخب کیا ہے۔ اس نکتہ کی بلندی کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے لگایا جاسکتا ہے: ”اگر ہم ان لوگوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیں جو زبان تہذیب اور عادات و اطوار ہر چیز میں ہم سے دوری اور فرق رکھتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم کسی ایسے کا انتخاب کریں جو ایک طرف تو ہماری زبان سے واقف ہو، اور اس سطح پر ہو کہ ہمارے پیغام کو درک کر سکے اور ہم سے رابطہ برقرار کر سکے۔ اور دوسری طرف جنہیں ہم پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ان کی زبان تہذیب اور عادات و اطوار سے بھی بخوبی

آگاہی رکھتا ہوا اور بہتر یہ ہوگا کہ خود ان ہی میں سے ہو۔ لیکن اس طرح ہو کہ ہم سے بیگانہ نہ ہو۔ خدا ذات ”واجب الوجود“ کمال مطلق اور لامتناہی ہے۔ اس کے علاوہ ساری کائنات ”ممکن الوجود“ ناقص اور فانی ہے۔ لہذا اگر خداوند تعالیٰ اپنا پیغام اور شریعت بندوں تک پہنچانا چاہے تو کسی ایسی ہستی کے انتخاب کی ضرورت ہے جو ایک طرف تو انسان ہو، انسان کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو اور دیگر انسانوں کی طرح خود سوتا جاگتا، اٹھتا بیٹھتا، ملتا جلتا اور انسانی زبان بھی بولتا ہو اور دوسری طرف کمال مطلق اور واجب الوجود کے پیغام کو پہنچانے کے لئے لازمی ظرفیت، صلاحیت اور شایستگی رکھتا ہو۔ ان کی زبان بھی جانتا ہو اور اس کی زبان بھی۔ اسی وجہ سے اسلامی تہذیب میں پیامبر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ پیغمبر ایک انسان ہے جو عہدہ رسالت کے لئے چن لیا گیا وہ بندہ بھی ہوتا ہے اور رسول بھی ”عبدہ و رسولہ۔ ما کان محمد اباً احد الا کان بشراً رسولاً“ ان دو الفاظ (بشر اور رسولاً) میں پیغمبر کی اعلیٰ ترین تعریف مضمر ہے۔

اس طرح پیغمبر انسان ہے لیکن ایسا انسان جو معنوی، روحی، فکری اور اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ نے اسے اپنے مخصوص فیضان سے درجہ کمال عطا کر کے انسان سازی پر مامور فرمایا ہے، لیکن رسالت کا مقصد محض انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اصلاح ہے، رسول اجتماعی طور پر پوری قوم، پورے معاشرے کی اصلاح کرتا ہے اور اسے ایک نئی شکل دے کر اس راہ پر گامزن کرتا ہے جو براہ راست خالق کائنات تک جاتی ہے۔ پیغمبر مادی سطح سے روح کی گہرائیوں کی طرف جاتا ہے اور دوبارہ وہاں سے قوم و معاشرہ کی اصلاح اور تبدیلیوں کے لئے ایک نئی الہی قوت کے ساتھ واپس سطح ہستی پر ابھرتا ہے تاکہ غیر مطلوبہ نظام و عقائد منسوخ کر کے ان کی جگہ مطلوبہ نظام و عقائد کو رائج کر کے اور دنیائے ہستی کو تجلیات نو سے معمور کر دے۔

ایک طرف تو پیغمبر علم الہی کا حامل ہوتا ہے (علم وہی)، دوسری طرف اس سے کسی گناہ یا غلطی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا کیونکہ اگر وہ خطا اور غلطی کی زد پر ہوگا تو ہم پیغام الہی کے ابلاغ کا ذریعہ اور اللہ کے ترجمان کی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔ پیغمبر کی شخصیت

کے دورخ ہوتے ہیں۔ ایک خدا سے پیغام وصول کرنا دوسرا اس پیغام کو خلق خدا تک پہنچانا اور یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ ہر طرح کے گناہ اور اشتباہ سے مبرا ہو۔ ایک طرف سے انسان ہو اور دوسری طرف الہی انسان ہو۔

(۲) انبیاء کرام: انسان کامل کے نمونے

دین اسلام ایک ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد توحید ہے اور رسالت اس عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ اگرچہ خدا اور اس کی وحدانیت پر اعتقاد ہمارے دین کا محور ہے تاہم یہ اعتقاد، حضرت محمدؐ کی تعلیمات اور کلام کی سچائی پر اعتقاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں دین کے لانے والے (الہی ادیان میں) یا دین کے بنانے والے (خود ساختہ ادیان میں) خود ہی اساس و محور ہوتے ہیں، لیکن اسی کے مقابل، اسلام میں محور و اساس ذات باری تعالیٰ ہے اور اس لحاظ سے اہل مغرب کا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام محمدؐ یعنی محمدیت ہے۔ درحقیقت یہ اللہ لازم یعنی خدا ایت ہے۔ مگر حضرت محمدؐ صلعم کی نبوت و رسالت پر ایمان و اعتقاد رکھنے کے بعد ہی ایک مسلمان کی رسائی ذات باری تک ہوتی ہے۔

اسلامی نظریہ کے مطابق انسان افضل المخلوقات اور اللہ کی خلقت کا بہترین شاہکار ہے۔ اور پیغمبر انسان کامل کا نمونہ ہے۔ وہ انسان جس کی خلقت کے تمام پوشیدہ اور بالقوہ امکانات ثابت ہو چکے ہیں۔ جس طرح ایک شاہکار کسی فنکار کے فن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح پیغمبر انسانوں کے درمیان قدرت کے فن تخلیق کا افضل ترین نمونہ ہے۔ خدا نے اس کی خاطر کائنات کو خلق کیا ہے اور غالباً حدیث قدسی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ”لولاک لما خلقت الافلاک“ یعنی اے محمدؐ اگر آپ نہ ہوتے تو یہ زمین و آسمان خلق نہ کئے جاتے۔ لہذا ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مخلوق کے وجود کا سبب ذات محمدی ہے۔ بقول اقبال ے

خامہ اونقش صد امروز بست تابیار د صبح فردائے بدست
شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغ یک محمدؐ برفروخت

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ: ایک زندہ جاوید نمونہ عمل

اسلامی تہذیب میں حضرت محمد بن عبد اللہ کی شخصیت محض ایک تاریخی شخصیت نہیں ہے بلکہ ایک ابدی حقیقت بھی ہے اور ایسی جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ پیغمبر کی ذات زمان و مکان میں ضو لگن ہونے کے ساتھ ساتھ عرفان و بلندی کی بھی حامل ہے۔

حضرت محمد سے محبت اور ان کی نبوت پر یقین، تمام دنیا کے مسلمانوں کو متفق اور متحد کرنے کی سب سے اہم طاقت ہے۔ نبوت اور پیغمبر سے لگاؤ، مسلمانوں کو ایک عالمی اکائی کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ حضرت محمد سے لگاؤ اور محبت اور ان کی سنت کی پیروی کی وجہ سے، ایشیا سے لے کر افریقہ تک کے مسلمان آپس میں حیرتناک اتحاد اور مماثلت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے اشعار ہیں:

از نبوت در جہاں تکوین ما از نبوت دین ما آئین ما
نبوت کی وجہ سے دنیا میں ہماری خلقت ہوئی نبوت ہی ہمارا دین و آئین ہے
از نبوت صد ہزار ما یک است جزو ما ہم یک جز لا ینفک است
نبوت ہی سے ہم متحد ہیں ہمارا جزو بھی جزو لا ینفک ہے
آن کہ شان اوست یہدی من یرید از رسالت حلقہ گرد ما کشید
وہ جس کی شان یہدی من یرید ہے رسالت کے ذریعے ہمارے گرد ایک حلقہ بنایا
ما زحکم نسبت او ملت ایم اہل عالم را پیام رحمتیم
ہم اس سے منسوب ہونے کی وجہ سے ایک ملت ہیں اہل دنیا کے لئے پیغام رحمت ہیں
از رسالت ہم نوا گشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
رسالت ہی کی وجہ سے ہم سب ایک آواز ایک مزاج اور ایک مقصد ہیں
یہاں تک کہ غیر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک مغربی مصنف لکھتا

ہے ”مسلمانوں کو حضرت محمد سے جو وابستگی ہے ہم ساکنان مغرب اس سے ناواقف ہیں اور مسلمانوں کے معاشرے میں عقیدہ نبوت کے عظیم کردار کو سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ ہم لوگ پیغمبر اسلام کو صرف ایک تاریخی شخصیت کی نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ مسلمانوں کے نزدیک ان کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دانستہ یا نادانستہ ہم مسلمانوں کی دل شکنی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ میں یورپ سے انڈونیشیا تک جہاں بھی گیا، ہر جگہ امت اسلامیہ کی رگوں میں عشق محمدی کو خون کی طرح جاری و ساری دیکھا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اخوت و اتحاد کی سب سے اہم وجہ یہی عشق محمدی ہے۔ البتہ پیغمبر اسلام سے مسلمانوں کی محبت مختلف انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ شمالی افریقہ میں پیغمبر اسلام کی شان میں عارفانہ اور عاشقانہ شعر خوانی ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں پیغمبر اکرم کے یوم ولادت کو بڑے نزک و احتشام سے مناتے ہیں، قوالیاں ہوتی ہیں، اس رسم کو وہ میلاد کہتے ہیں۔ اسلام کی ایک شان و امتیاز یہ بھی ہے کہ اپنے ماننے والوں میں پیغمبر سے اس طرح کے والہانہ عشق و محبت پیدا کرنے کے باوجود، دوسرے ادیان و مذاہب کی طرح انسان اور خدا کے مابین سرحد کو گم نہیں ہونے دیا۔“

پیغمبر اسلام بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ مثلاً گناہ و اشتباہ سے ان کا محفوظ ہونا، ان کی بے نظیر رہنمائی، لا جواب قوت تشکیل و تعمیر، شرک و اوہام اور جور و استبداد سے بے مثال نبرد آزمائی وغیرہ۔ اس کے باوجود مسلمان اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ ان کے نبی بشر تھے۔ مسلمان ہر روز متعدد بار دہراتے ہیں اور کہتے ہیں اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صرف خدا کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں) اور یہ نکتہ تاریخ ادیان عالم میں بے نظیر اور بے مثال ہے۔

اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حضرت محمد کی وہ ذات ہے جو محبوب خالق اور منتخب خلاق تھی، وہ شخصیت ایسی تھی جس کے لئے زمان و مکان بنائے گئے، یعنی محمد بشر تھے، اور تمام ضرورتیں جو بشریت کے تقاضے کے تحت ہیں ان کے اندر موجود تھیں اور دوسروں کی طرح مکلف

تھے یعنی ان احکام کو، جو ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچے تھے، انجام دیں بلکہ بعض مشکل احکام ان کے لئے مختص تھے۔ مثلاً رسول خدا پر تہجد و نافلہ شب واجب تھیں۔

دیگر مذاہب میں پیغمبروں کا الہی تصور پیدا ہو گیا ہے اور جس محنت و ریاضت کو عام لوگوں کے لئے تجویز کیا ہے وہ خود ان سے ساقط تھی۔ اس کے برعکس اسلام میں پیغمبر اسلام نے خود کو کسی محنت و ریاضت سے کبھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا بلکہ دوسروں کی طرح ان سے زیادہ خوف خدا دل میں تھا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عبادت کرتے تھے، زیادہ نمازیں پڑھتے تھے، زیادہ روزے رکھتے تھے، جہاد کرتے تھے، خلق خدا پر احسان کرتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ زندگی گزارنے کے لئے کسی کا بوجھ نہیں بنے۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کی اہمیت و عظمت کو دوسرے ادیان جیسے بودھ مت اور عیسائیت میں مذہبی رہبروں کے سلسلے میں موجود عقائد اور اسلامی عقیدے سے تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان اپنے پیغمبرؐ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ (حضرت محمدؐ) خاتم المرسلین، افضل الانبیاء تھے، محبوب ربانی تھے اور مصلحت تخلیق زمان و مکان تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام صرف مسئلہ وحی اور لوازم وحی (جیسے عصمت و معجزہ وغیرہ) کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے مختلف تھے۔ وحی انہیں انسانیت سے خارج نہیں کرتی بلکہ انسانیت کا ایک اعلیٰ و ارفع نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ انہی وجوہ و دلائل کی بنا پر وہ دوسروں کے رہبر و رہنما ہیں۔

پیغمبر اسلام کا دیگر دینی رہنماؤں اور دین لانے یا بنانے والوں پر دوسرا بڑا امتیاز نبرد آزمائی، جہاد اور تعمیر و تشکیل ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب میں پیغمبر یا دینی پیشوا کے متعلق تصور صرف معنوی، روحانی، رہبانی تصور تھا۔ غیر اسلامی ادیان و مذاہب میں نبوت و بعثت کا مقصد صرف تزکیہ روح اور اخروی سعادت کا حصول تھا، جہاں دین کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سیاست و معاشرہ، دینی رہبروں کے دائرہ کار سے باہر تھا۔ لیکن اسلام میں نبوت کا مقصد خدا کی معرفت اور اس کا تقرب اور اسی کے ذریعہ ظلم بے انصافی اور جہالت وغیرہ کے خلاف نبرد آزمائی ہے۔

اسی وجہ سے پیغمبر اسلام دیگر مذاہب کے لانے اور بنانے والوں کے برعکس محض ایک ”پیغام پہنچانے والے“ نہ تھے، بلکہ انھوں نے پیام الہی کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد کے لئے بھی قدم اٹھائے اور شرک و اوہام اور ظلم و جہالت کی بیخ کنی کے لئے نبرد آزمائی بھی ہوئے اور ایسے سماج و تہذیب کی بنیاد رکھی اور ایک ایسی امت بنائی جس نے قیصر و کسریٰ کے مخلوق کو لرزہ بر اندام اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو سرنگوں کر دیا۔

پیغمبرؐ کے متعلق یہ تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے اور جو حضرت محمدؐ کی زندگی میں مجسم ہوا ہے، دیگر ادیان میں دینی پیشواؤں کے تصور سے بالاتر ہے۔ دیگر مذاہب میں رہبروں کے عرفانی و روحانی تجربات سماج سے دوری، صحر اور پہاڑ یا یر نشینی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے نشاندہی کی ہے: ”پیغمبر عرفانی تجربات کی گہرائیوں سے سماجی زندگی تک واپس آتا ہے اور زمانے کے حالات میں داخل ہوتا ہے تاکہ تاریخ کے بہاؤ کو قابو میں کرے اور اس طریقے سے کمال مطلوبہ کی ایک نئی دنیا خلق کر سکے۔“

اس طرح بقول استاد شہید مطہریؒ ”اسلام میں پیغمبر روحانی راستوں سے خلق کی طرف سے خالق کی طرف رجعت کرتا ہے یعنی سیور من الخلق الی الخالق لیکن اس کا صریح نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ان ہی راستوں سے خلق کی طرف واپس آتا ہے تو اپنے ساتھ ایک ارادہ لے کر لوٹتا ہے، حیات انسانی کی اصلاح کا ارادہ اور اس طرح سیور علی الخلق فی الخلق پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔“^(۱)

اسلام کی یہی دو باتیں یعنی پیغمبر کا انسان ہونا اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں پیغمبر کی عملی شمولیت کے باعث ہی پیغمبرؐ اپنے ماننے والوں کی آئندہ نسلوں کے سامنے نمونہ کے طور پر سامنے آئے، جب کہ دوسرے مذاہب ایک مذہبی پیشوا کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی ذات اس مذہب کے پیروؤں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ اس کے برعکس پیغمبرؐ اسلام کی ذات تمام

(۱) استاد مطہری: مقدمہ ای بر جہاں بنی اسلامی

افعال مسلمانوں کے واسطے قیامت تک کے لئے ایک نمونہ ہے۔ دنیا کے کسی حصہ اور کسی زمانہ کے اسلامی انقلاب میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہے جس کے لئے پیغمبر اسلام کی زندگی نمونہ نہ ہو۔

پیغمبرؐ کی تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے

۱- تحریف کرنے والے (مسیحی اور یہود جنہوں نے آسمانی کتابوں میں حسب منشا تبدیلیاں کیں)
۲- فکری اور اخلاقی مادہ پرست (اکثر مشرکین قریش اسی گروہ سے متعلق تھے جو نفس اور شکم کے بجاری تھے)

۳- مکہ و مدینہ کے سیاست داں، صاحبان اقتدار اور قوم پرست افراد۔

مکہ اور مدینہ کے سیاست داں، قوم پرست اور طاقتور لوگ (ابوسفیان، ابو جہل اور ابولہب قریش کی قوم پرستی کے نمائندے اور عبداللہ بن ابی مدینہ کی قوم پرستی کا نمائندہ)، حیرہ، عسان، ایران و روم سے متعلق افراد (اس زمانے کی بڑی طاقتیں اور ان کے کارندے) سیاسی طاقتیں، اقتصادی طاقتیں، کعبہ کے متولیوں اور درباری مذہب کی رسمی طاقت، پیغمبر اسلامؐ نے ان سب کے سلسلے میں اسلام کے نقطہ نظر کو واضح کر دیا۔ ۱۴ برس بعد اسلامی انقلاب بھی انہی محاذوں سے برسر پیکار ہوا۔ اس طرح پیغمبر اسلامؐ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے زندہ و موجود نمونہ عمل ہیں۔

حضرت فاطمہؑ کا اسوۂ جاوید

حضرت فاطمہ زہراؑ صلوات اللہ علیہا^(۱) پیغمبر اسلام کی دختر ارجمند، جن سے رسول اکرمؐ کی ذریت و نسل طاہر دنیا میں باقی ہے، حضرت علیؑ شیر خدا کی زوجہ اور شیعوں کے گیارہ اماموں کی مادر گرامی ہیں جن کو اسلام نے خواتین کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔

اسلام نے محض کتاب اور شریعت پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ آئین کے ساتھ بعض شخصیتوں کو راہنما اور عملی نمونے کے طور پر منتخب کیا ہے تاکہ وہ کتاب کی تعلیم اور اسلام کی روح اور اس کے جوہر کو اپنے کردار و عمل کی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر اور بارہ امام اسی طرح کے نمونے ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے مرد و عورت کو مختلف خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بہت سے ایسے حالات، کیفیتیں، جذبات اور تعلقات عورت میں پائے جاتے ہیں جو مرد میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ اسلام، پیغمبر اور ائمہ کے ساتھ ساتھ، عورتوں کے لئے بھی خاص نمونہ اور اسوہ پیش کرے۔ ایک ایسی ہستی جو یہ بتائے کہ ایک مسلمان خاتون کو کیسا ہونا چاہئے؟ باپ، شوہر، فرزند اور سماجی و سیاسی زندگی کے سلسلے میں ایک عورت کا کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟ جناب فاطمہؑ ایسی ہی ہستی ہیں جنہیں اسلام نے ایک مثالی خاتون کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے جناب فاطمہؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”مریم اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین خاتون تھیں مگر تم ہر زمانہ اور ہر صدی کی اعلیٰ ترین خاتون ہو۔“

اس طرح جناب فاطمہ زہراؑ تمام خواتین کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہیں۔ نامور مصری محقق عباس محمود العقاد بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”ہر دین میں ایک ایسی مقدس اور کامل خاتون کا وجود ہوتا ہے جسے اس دین کے ماننے والے خداوند تعالیٰ کی نشانی سمجھتے

(۱) توفیق ابوعلم، ”فاطمہ زہراؑ“، ص ۱۱

ہوئے اس کی تقدیس کے معتقد ہوتے ہیں، عیسائی مذہب میں جناب مریم کا وجود مقدس اور افضل مانا گیا ہے، اسی طرح اسلام میں حضرت زہراؑ ایک مثالی خاتون ہیں۔^(۱)

ہر دین میں ایک مقدس خاتون کامل، اس دین کی تعلیمات اور خصوصیات کا عملی مظہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تحریف شدہ مسیحیت چونکہ رہبانیت، گوشہ نشینی اور معاشرے سے بے تعلق ہو کر معنویت اور روحانیت سے منسلک رہنے کا عقیدہ پیش کرتی ہے، اس لئے مذہب کی مثالی خاتون یعنی مریم عذرا کی جو شکل مسیحی پیش کرتے ہیں وہ ان ہی خصوصیات کی مظہر ہے۔

لیکن اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے متعدد پہلو ہیں۔ اسلام میں معنویت، اجتماعی و سیاسی زندگی سے تعلق، عبادت، خاندانی اور گھریلو ذمہ داریاں، عرفان اور جہاد یعنی زندگی کا ہر رخ موجود ہے۔ حضرت زہراؑ نے بھی جو اسلام کی مثالی خاتون ہیں، جن کی پاکیزہ سیرت تمام مسلمان خواتین کے لئے نمونہ ہے، اپنی زندگی میں دین اسلام کے ہر رخ کو پیش فرمایا ہے۔ اکثر علماء و محققین مثلاً تلقی سبکی، جلال سیوطی، زرکشی اور تلقی مقریزی تمام دنیا کی خواتین پر حضرت فاطمہ زہراؑ کی افضلیت اور ان کے کردار اور مثالی سیرت کے معترف ہیں اور اس کا نمایاں طور پر ذکر بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ تلقی سبکی جو علمائے اہل سنت میں سے ہیں اس سوال کا کہ ”اسلام میں افضل ترین خاتون کون ہیں؟“ یوں جواب دیتے ہیں ”میرا اعتقاد ہے کہ فاطمہ زہراؑ ساری دنیا کی عورتوں میں افضل ترین خاتون ہیں۔“ ابن داؤد نے اسی سوال کے جواب میں کہا ہے کہ ”جب پیغمبر خداؐ نے جناب فاطمہ زہراؑ کو اپنے جسم کا ایک ٹکڑا کہا ہے تو اب اس کے بعد کسی اور کا ان سے افضل ہونا قطعی ناممکن ہے، اس لئے کہ پیغمبر کے جسم کے ٹکڑے پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

معتبر احادیث و اخبار کے مطابق پیغمبر اسلام نے خود جناب فاطمہ زہراؑ کو ”دنیا کی تمام عورتوں کی سردار“ کہا ہے اور ان کی پاکیزہ سیرت کو خواتین عالم کے لئے تاریخی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اہل سنت کی معتبر کتابوں میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے جناب فاطمہ

سے کہا: ”جان پدر فاطمہ! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم تمام خواتین سے افضل اور میری پوری امت کی خواتین کی سردار ہو اور با ایمان عورتوں میں سب سے برتر ہو؟“

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے جناب فاطمہؑ سے پوچھا: ”اے جان پدر! کیا تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی کہ تمام عالم کی خواتین میں سب سے افضل و برتر ہو؟“ جواب میں جناب فاطمہ زہراؑ نے سوال کیا کہ ”اگر میں سب سے افضل ہوں تو مریم بنت عمران کیا ہیں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا ”وہ صرف اپنے دور کی خواتین میں سب سے افضل ہیں اور تم ہر دور کی خواتین میں سب سے افضل ہو۔“ اس طرح جناب فاطمہ زہراؑ دنیا کی تمام خواتین کے لئے ایک مثالی خاتون اور اسوۂ جاوید ہیں۔

انھوں نے نمونہ پیش کیا ہے کہ ایک مسلمان خاتون کو کس طرح روحانیت سے بھی متعلق رہنا چاہئے اور خاندان کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ سماجی اور عقیدتی جہاد میں شامل رہنا چاہئے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی میں ہم عرفان، امور خانہ داری کی انجام دہی، اور اجتماعی و اعتقادی جہاد تینوں پہلوؤں کو اپنے عروج پر پاتے ہیں۔

مباہلہ جناب فاطمہ زہراؑ کے معنوی و عرفانی مقامات کی رفعت کی ایک ابدی سند ہے۔ مباہلہ کے تاریخی واقعہ میں نجران کے نصارا جو عبادت و ریاضت میں مشہور تھے، ان سے مقابلہ میں روحانی و معنوی اعتبار سے پورے گروہ اسلامی میں صرف پانچ افراد کو منتخب کیا گیا، ان پانچ روحانی افراد میں سے ایک فرد جناب فاطمہ زہراؑ ہیں۔ نصاریٰ اپنی معنوی قوت پر بہت نازاں تھے، مگر ان خدائی ہستیوں کے مقابل ٹھہرنے کی جرات نہ کر سکے۔ ابو حارثہ اسقف نصاریٰ مباہلہ سے روگرداں ہو گیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ ”تو نے محمد سے مباہلہ کا خیال ترک کیوں کر دیا؟ تو اس نے جواب دیا ”خدا کی قسم میں نے ایسے چہرے دیکھے جو اگر دعا مانگیں تو پہاڑ حرکت میں آجائیں، اور اگر ہمارے حق میں بددعا کریں تو سال نہ گزرے کہ نصاریٰ میں سے ایک شخص دکھائی نہ دے اور ان کی بددعا سے سب کچھ تباہ ہو جائے۔“

یہ واقعہ مکمل طور پر حضرت فاطمہ زہراؑ کے اعلیٰ عرفانی و معنوی منزلت کی نشاندہی کرتا ہے۔ مسیحیت کے برخلاف اسلامی عرفان و معنویت رہبانیت یا ریاضت کرنے والوں کا عرفان نہیں ہے، بلکہ ایک جہاد مسلسل ہے جہاں انسان اجتماعی زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ کا عملی نمونہ جناب فاطمہ زہراؑ نے پیش کیا ہے جو تمام دنیا کی عورتوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ زہراؑ نے بعض غزوات میں بھی شرکت کی اور پیغمبرؐ نے اجتماعی مسائل میں آپ سے مشورے بھی لئے ہیں اور جنگوں میں بعض ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی تھیں۔

جناب فاطمہ زہراؑ نے معاشرے کی اجتماعی اور فکری زندگی میں بھی شرکت کی ہے، پیغمبرؐ کی حدیثیں بھی بیان فرماتی تھیں، خواتین کی ہدایت بھی کرتی تھیں، جنگوں میں حصہ بھی لیتی تھیں اور وقت ضرورت تلواروں اور تیروں کی بارش میں اپنے والد اور اپنے شوہر کا ساتھ بھی دیتی تھیں، پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، زخموں کی مرہم پٹی اور نگہداشت بھی کرتی تھیں اور لشکر اسلام کی غیرت کو بھی لگا رتی تھیں۔^(۱) واقدی نے لکھا ہے کہ ”حضرت فاطمہ زہراؑ نے جنگ احد میں مجروحین کی مدد کی اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی وہ اپنے والد ماجد کی معاون رہی ہیں جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ جب خواتین پیغمبرؐ کی بیعت کر رہی تھیں تو وہ جناب رسول خدا کے ساتھ تھیں۔

پیغمبرؐ کے بعد بھی جناب زہراؑ اسلامی معاشرہ کی خبرگیری کرتی رہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جناب فاطمہ زہراؑ وہ پہلی طاقتور تھیں جو فریاد کرنے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے مسجد نبویؐ میں گئیں آپ کی شعلہ بیان اور زلزلہ افکن تقریر آپ کی شجاعت، شہامت الہی نگاہ اور سیاسی و اجتماعی دور بینی کو واضح کرتی ہے۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ عورت اسلامی معاشرہ میں اجتماعی سیاسی اور عورتوں کے بارے میں پیدا ہونے والے مسائل سے کنارہ کش نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ کی قسمت

(۱) رجوع کیجئے: ”فاطمہ زہراؑ از توفیق ابولعلم ص ۱۱۱ و ۱۲۴

بنانے حصہ لینے کے بعد بھی مسلم عورت کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ ”عورت“ ہے۔ ایسی صورت میں اسے اپنی عفت، اپنے تقدس اور پردہ کو برقرار رکھنا چاہئے۔ جناب سیدہؑ نے اپنی رفتار و گفتار سے مذکورہ بالا باتوں کو آشکار کیا ہے۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ خدا نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ ”کون سی چیز خواتین کے لئے سب سے اچھی ہے؟“ کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ حضرت علیؑ فوراً جناب فاطمہ زہراؑ کے پاس گئے اور ان سے اس سوال کے متعلق دریافت کیا۔ جناب فاطمہ زہراؑ نے کہا: ”آپ نے کیوں نہ کہہ دیا کہ خواتین کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ مردوں کی جانب نظر نہ کریں اور مردوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خواتین سے مرعوب نہ ہوں؟“ حضرت علیؑ جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں تشریف لائے اور یہی جواب دہرایا۔ رسولؐ خدا نے فرمایا: ”اے علیؑ! تم کو اس سے کس نے مطلع کیا؟“ حضرت علیؑ نے جواب دیا: ”فاطمہ نے۔“ اس پر پیغمبرؐ نے فرمایا ”سچ تو یہ ہے کہ فاطمہؑ میرے ہی جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔“ جناب زہراؑ نے ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان خاتون اسلامی معاشرے میں اپنی نسوانیت، عفت اور خودداری کے تحفظ کے ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی شرکت کی حقدار ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان خاتون، خاندان کی خدمات انجام دینا اور نئی نسل کی پرورش و پرداخت کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہراؑ ایک طرف عرفانی اور روحانی مقامات میں آیت تطہیر کی تفسیر ہیں، دوسری طرف اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی دخیل ہیں۔ خاندانی اور گھریلو ماحول میں ایک الفت شعار شریک حیات، ایک دختر وفادار اور ایک مادر مہربان بھی ہیں۔ جناب فاطمہ زہراؑ اپنے والد گرامی کے لئے ایک مثالی اولاد ہیں، وہ صرف اولاد ہی نہیں بلکہ اپنے باپ کی پرستار، مشیر، رفیق اور معین بھی ہیں۔ ٹکلیفوں میں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور انھیں تسلی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں ”ام ابیہا“ یعنی اپنے باپ کی ماں کہتے ہیں۔

جناب فاطمہ زہراؑ شوہر کے لئے ایک مہر و محبت کرنے والی شریک حیات، حضرت علیؑ کی

مونس تنہائی ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ مسلسل دکھ درد جھیل رہی ہیں لیکن پیشانی پر شکن تک نہیں آنے دیتی ہیں۔

جناب زہرا ایک ایسی ماں ہیں جن کی آغوش میں حسنؑ و حسینؑ اور زینبؑ جیسی اولاد پروان چڑھتی ہے۔ عبادات و اخلاق بلکہ ہر لحاظ سے جناب فاطمہ زہراؑ بلا تفریق ہر ایک کے لئے نمونہ ہیں۔

جناب فاطمہ زہراؑ: اسلام میں عورت کے بلند مقام کا مظہر

جناب فاطمہ زہراؑ اسلام میں خواتین کے مرتبہ کی عظمت و رفعت کی مظہر ہیں۔ تاریخ عالم میں پہلی بار اسلام نے خواتین کو باعتبار شخصیت انسان کامل بتایا ہے۔ یہاں تک کہ یونان جیسے ترقی پسند نظام میں بھی خواتین کو ثانوی درجہ دیا جاتا تھا حتیٰ کہ ظہور اسلام تک خود عرب عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں پست تر گردانتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں عربوں میں ایک مثل رائج تھی ”المرأة حیوان طول الشعر قصیر الفكر“ یعنی عورت ایک ایسا جانور ہے جس کی زلفیں طویل مگر عقل کوتاہ ہے۔ دوسریوں قبل تک نام نہاد متمدن مغربی ممالک میں بھی خواتین انفرادی حق ملکیت سے محروم تھیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں اسلام نے خواتین کو ایک کامل انسانی شخصیت عطا کی اور ”صنف“ کے بجائے ”تقویٰ“ کو بزرگی، برتری اور عظمت کا معیار قرار دیا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ نے اعلان فرمایا: ”المرأة الصالحة خیر من الف رجل غیر صالح“ یعنی ایک متقی عورت ایک ہزار غیر صالح مردوں سے بہتر ہے۔ (جامع الاخبار) اور فرمایا: ”من اخلاق الانبیاء حب النساء“ قرآن صریحی طور پر اعلان کرتا ہے: {لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ} (نساء/۳۲) ”مردوں کو حصہ ملتا ہے ہر اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے جو وہ حاصل کریں اور اللہ سے سوال کرو اسی کے فضل و کرم سے یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“ {لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

وَالْأَقْرَبُونَ} (نساء/۷) ”مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز تر کہ چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز چھوڑ جائیں چاہے وہ کم ہو یا زیادہ لازمی طور پر مقرر کیا ہوا حصہ۔“ قرآن نے یہ حکم بھی دیا: ”عاشروہن بالمعروف“ اور پیغمبرؐ نے فرمایا: ”ولا تضر بوا النساء کم فمن ضر بہن بغیر حق عصی اللہ ورسولہ“ یہ تمام آیات اور حدیثیں خواتین کی اس شخصیت اور احترام کو ظاہر کرتی ہیں جس کا اسلام قائل ہے۔ اسلام نے عورت کو مکمل انسانی حقوق دئے اور اس کی روحانی، فکری اور سماجی ترقی اور عظمت کے لئے راہ ہموار کی۔

اسلام میں عورت کی عظمت و بلندی اور ترقی و ارتقا کا جو نظریہ ہے وہ مغربی تمدن کے نظریہ ارتقاء سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام عورت کو اپنی نسوانیت اور عورت ہونے کی خصوصیت کے تحفظ کے ساتھ ترقی کرنا سکھاتا ہے۔ جبکہ مغربی تمدن عورت کو اپنی نسوانیت، اصل خاصیت اور اپنے حقیقی جوہر سے دست بردار ہو کر ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ترقی عورت کو زمرہ نسوانیت سے خارج کر دینا ہے، عورت کی ترقی نہیں ہے! مغرب یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی ترقی ناممکن ہے جب تک وہ شکل و صورت کے اعتبار سے مرد نہ بن جائے۔ دراصل یہ عورت کی سب سے بڑی تحقیر ہے جو حقوق نسواں کے تحفظ کے نام پر انجام دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام چاہتا ہے کہ عورت اپنی اصل صورت اور خصوصیت کا تحفظ کرے کیونکہ عورت کی اصل شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے اور عورت اپنے فرائض و مقاصد کو جو مرد کے فرائض و مقاصد سے کسی طرح بھی کم تر نہیں ہے، کو فراموش نہ کرے۔ عورت کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے اغراض و مقاصد اور فرائض میں ایک بڑا فریضہ آنے والے معاشرے کی مستقبل کی نسلوں کو پیدا کرنا اور ان کی تربیت ہے۔ اور ایک عورت کے لئے یہ قطعی نامناسب ہے کہ وہ انسان سازی جیسے عظیم فرض کو چھوڑ کر ’مشین سازی‘ کو اپنائے، جیسا کہ مغربی تمدن کا شعار ہے۔ اسلام ’مساوی حقوق‘ کا قائل ہے، ’مشابہ حقوق‘ کا نہیں۔ جبکہ اہل مغرب ’مساوی‘ حقوق کے نام پر ’مشابہ‘ حقوق کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور عورت سے

ثابت ہوئی اور کفر رسوا ہوا۔ کفار اور مشرکین کہتے تھے کہ پیغمبر اسلام مقطوع النسل ہیں، جبکہ قرآن حکیم اعلان کر چکا تھا کہ {إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ} یعنی ہم نے تمہاری نسل کو کثرت عطا کی۔ بے شک تمہارے تمام دشمن ابتر ہیں۔ اور یہ ’کوثر‘ رسول خدا کو جناب سیدہ کی صورت میں عطا کی گئی۔ اس طرح مومنین اور علمائے اسلام کے نزدیک جناب فاطمہ صرف رسول خدا کی محبوبہ صاحبزادی ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی شخصیتوں میں مقدس ترین شخصیت، قرآن ناطق، صحت دعوائے رسالت کی گواہ اور اعجاز قرآنی کی ثابت کرنے والی بھی ہیں۔

جناب فاطمہؑ زہراؑ اس روحانی عظمت کی حامل ہیں کہ انہیں ’بتول‘ کہا گیا ہے۔ بتول ایسی خاتون کو کہتے ہیں جس کے رشتے دنیا سے منقطع اور حق سے استوار ہو جاتے ہیں۔ ’مجمع البحار‘ میں آیا ہے کہ حضرت مریمؑ اور جناب فاطمہؑ زہراؑ دونوں کو ’بتول‘ کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مقدس خواتین وہ تھیں جن کے رشتے دنیا سے منقطع ہو کر حق سے استوار ہو چکے تھے۔ حضرت فاطمہؑ کو مسلمان صدیقہ، مبارکہ، طاہرہ، راضیہ اور مرضیہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر لقب ان کی عظمت کے کسی نہ کسی رخ کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک طرف تو جناب فاطمہؑ زہراؑ مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ ہیں۔ ایسی خاتون جیسی اسلام چاہتا ہے، ایسی نمونہ خاتون جسے پیغمبر اسلام نے خود اپنے دست مبارک سے سانچے میں ڈھالا اور اپنی پر التفات تربیت کے زیر سایہ پروان چڑھایا۔ دوسری طرف وہ اسلام میں خواتین کی برتری اور بلندی کی مظہر بھی ہیں۔

امامت و ولایت: ابعاد (Dimensions) اور مفہیم

امام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی سماجی، سیاسی، علمی یا دینی تحریک کے سلسلے میں کسی گروہ کی رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے۔^(۱) امام اچھی صفات اور معنوی کمالات میں سرآمد خلق اور سیاسی، سماجی، علمی اور فکری میدان میں انسانوں کا رہبر اور پیش رو، اور انفرادی و سماجی برتاؤ میں ان کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔^(۲) امام وہ شخص ہے جو آسمانی دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوا ہے۔ وہ شخص جو خدا کے حکم اور نص کی بنیاد پر امت کی رہبری اپنے ذمے لیتا ہے۔ امام نہ صرف دنیوی اور ظاہری خلافت میں پیغمبر کا جانشین ہے بلکہ پیغمبر کے علم باطنی اور روحانی خصوصیات کا بھی حامل اور اس کے دین کا شارح بھی ہے۔

نبوت و امامت میں تعلق

لفظ ”نبی“ عربی میں ”خبر لانے والے“ کے معنی میں ہے اور فارسی میں اس کا ترجمہ پیامبر یا پیغمبر ہوتا ہے۔ لفظ ”رسول“ بھی ”بھیجے ہوئے“ کے معنی میں ہے۔ انبیاء ایک قبول کرنے والی (Receiving) مشین کی طرح ہیں جو بشریت کے جسم میں لگادی گئی ہیں۔ وہ لوگ اللہ کی طرف سے منتخب افراد ہیں اور ان کے اندر یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ الہی پیغام کو دریافت کریں اور انسانی معاشرے تک پہنچائیں۔ ائمہ اور اوصیاء اسی پیغام کی حفاظت کرنے اور پھیلانے والی (Transmitting) مشین ہیں۔ ائمہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء کے پیغام کو سماج میں نافذ کرتے ہیں۔ ہر امت پیغمبر اور پیغمبر کے بعد اس امت کا امام، معنوی و علمی درجات کے لحاظ سے سرآمد

(۱) رجوع کیجئے: ”شیعہ در اسلام“ از علامہ طباطبائی، ص ۲۳۱

(۲) اصل الشیعہ و اصولہا، از شیخ محمد حسین کاشف الغطا، فصل امامت

خلق اور بلند مرتبے کے حامل اور سب سے افضل ہیں۔ قرآن کے رو سے کبھی کبھی نبوت و امامت ایک جگہ اکٹھا ہو جاتی ہیں اور ایک فرد رسالت و امامت دونوں عہدوں پر فائز ہو جاتا ہے۔ نبی شریعت کو لوگوں تک پہنچاتا بھی ہے اور اس کو معاشرے میں نافذ بھی کرتا ہے اور روحانی و مادی امور میں لوگوں کی رہبری کرتا ہے۔ قرآن میں پیغمبروں کا امام کے ذریعے تعارف کرایا گیا ہے۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا۔ (بقرہ: ۱۲۴)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

وَجَعَلْنَاهُمْ أَيْمَةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا۔ (انبیاء: ۷۳)

حضرت محمد رسول بھی تھے اور امام بھی۔ پیغام کے لانے والے بھی تھے اور اس کی وضاحت کرنے والے بھی اور امامت کے لئے نمونہ اور روحانی رہبر تھے۔ پیغمبر کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، معاشرے میں صرف شریعت و قانون رہ گیا، لیکن قانون کے مفسر اور شارح کی جگہ خالی ہو گئی۔ اس وجہ سے رسول خدا کے بعد ایسے افراد کی ضرورت تھی جو خدا کی طرف سے منصوب ہوں، علم الہی کے ابدی سرچشمہ سے منسلک ہوں، روحانی خصوصیات کے وارث ہوں، اسلام پھیلانے والے اور مقاصد کی تشریح کرنے والے، اسرار باطنی اور روح شریعت سے آشنا ہوں۔

اس طرح جب پیغمبر اسلام کے بعد نبوت ختم ہو جاتی ہے تو امامت اور حفاظت شریعت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

امامت اور ولایت کی ضرورت

(الف) اللہ کے عنایت و فضل کی اصل اور ہدایت عامہ کی اصل جو ظہور انبیاء کا وجودی سبب ہے، بقائے امامت کی وجہ بھی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق چونکہ خداوند عالم ”واجب الوجود بالذات“ ہے، فیاض مطلق ہے، یعنی اپنی کمال وجود کی وجہ سے اپنے مختلف فضل و عنایت کو مخلوقات سے دریغ نہیں کر سکتا ہے۔ خلافت تو انائی اور کمال ”فیاضی“ کا لازمہ ہے۔ ناقص انسان کی سطح پر بھی ایک عظیم فنکار کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے فن پاروں پر عنایت کی نظر نہ کرے اور اس کو کسی پہلو سے ناقص چھوڑ دے۔ جب ناقص افراد کا یہ حال ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم اپنی مخلوقات کو بغیر اصلاح اور ہدایت کے چھوڑ دے اور سعادت حاصل کرنے کے مواقع فراہم نہ فرمائے۔ ہدایت و عنایت خداوندی تمام مخلوقات کے لئے ہے خواہ ایک ذرہ بے مایہ ہو خواہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیزیں۔

اسی ہدایت عامہ اور فضل و عنایت کی بنا پر خداوند عالم نے انسانوں میں پیغمبر اور نبی بھیجے تاکہ ان کی اس لغزشگاہ حیات میں سعادت کے راستے طے کرنے میں مدد، ماورائے افق محسوسات کے مقصد کی طرف رہنمائی کرے اور انسان کی سماجی زندگی میں ضروری قانون کو اس کے لئے فراہم کرے۔ لیکن جب ربانی ہدایت لوگوں تک پہنچا دی گئی اور قانون مدون طور پر ان کے سامنے پیش کر دیا گیا، پھر ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس قانون کو برقرار رکھیں، اس کی توضیح و تشریح و توسیع کرتے رہیں نیز لوگوں کو مضبوطی سے صراط مستقیم پر باقی رکھیں۔

اللہ کی عنایت و فضل و ہدایت عامہ کے لئے، جس نے نبوت کو انسان کے حوالے کیا، یہ ممکن نہ تھا کہ دوسری ضرورت کو تکمیل کئے بغیر چھوڑ دیتا۔ یہیں سے امامت و ولایت کی ضرورت آشکار ہوتی ہے۔

(ب) الوہی جہان بینی (Divine World-View) کے مطابق اسلام ایک ابدی و غیر فانی دین ہے جو ہر زمانہ میں تمام انسانوں کے لئے معتبر ہے اور ہر قسم کے تاریخی یا اجتماعی رد و بدل سے بری ہے۔ ایک ایسا دین جو بنیادی اور ثابت قوانین پر مبنی ہے، جو تمام شرائط میں قطعیت رکھتا ہے۔ اسلام ابدی اور جاوید ہے۔

اس دعوے کا لازمہ یہ ہے کہ کاروان انسانیت جادۂ حیات کے جس مرحلے میں بھی قدم رکھے اور تغیر و ترقی کی جس منزل پر بھی پہنچ جائے اس کے لئے واحد راہ عمل اسلام ہی ہے۔ دوسری جانب یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زمانہ اور انسانی حالات مسلسل تغیر پذیر اور انسانی سماج ہمیشہ فطری انقلابات کی زد پر اور کمال و تکامل کے راستے پر واقع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دین اور فطرت کے بنیادی اصول ہمیشہ ایک جیسے رہتے ہیں لیکن ان اصول کی مطابقت اور ان کے مصداق بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان دو باتوں یعنی دین اسلام کی جاودانی اور حالات و زمانے کے تغیر و تحول میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے امامت اور غیبت کے زمانے میں ولایت فقیہ کا نظریہ پیش کر کے ان دونوں اصول میں ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ چنانچہ ”امامت“، ”ولایت“ اور ”اجتہاد“ یہ تین بنیادی اصول ہیں جو تاریخ کے صفحات میں اسلام کی ہمیشگی کی ضمانت اور توجیہ کرتے ہیں۔

(ج) دوسرے تین وجوہات کی بنا پر بھی امامت کی ضرورت پڑتی ہے:

(۱) اسلامی حکومت کے لئے

(۲) معارف و احکام اسلام کے بیان کے لئے

(۳) انسان کی معنوی سعادت اور باطنی اعمال کی رہبری کے لئے

پیغمبرؐ نے شریعت کو انسانوں تک پہنچایا، لیکن صرف شریعت و نظام الہیہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کو عمل میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر لوگوں کو شریعت الہیہ پر عمل پیرا کرانے پر ایسے افراد مامور کئے جائیں جو خود شک و شبہ میں گرفتار اور نفس کے بندے ہوں تو الوہی معاشرہ

اور اسلامی نظریاتی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جو شخص اسلامی معاشرے کی باگ ڈور سنبھالے، وہ معصوم اور مامور من جانب اللہ ہو۔

اسی طرح معارف و احکام اسلامی کی ترویج کا ذمہ دار اسی کو ہونا چاہئے جس کا خمیر روح اسلام سے ہو اور جس کا تعلق خدا سے ہو۔

پیغمبر اسلام کی رسالت محدود نہیں بلکہ ابدی ہے اور تا قیامت رہے گی، مگر ان کی ظاہری زندگی بعثت کے بعد بہت محدود رہی۔ اسی وجہ سے ہر دور کے لئے ایسے فرد کی ضرورت ہے جو پیغمبر تو نہ ہو لیکن پیغمبر سے جدا بھی نہ ہو۔ چنانچہ ائمہ کی ذوات مقدسہ ایسی ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق کہا گیا ہے: ”اولنا محمد و اوسطنا محمد و آخرنا محمد“ چنانچہ جو ہر جلوہ کی حیثیت سے یہ لوگ حضرت محمدؐ سے جدا نہیں ہیں۔

ائمہ کی خصوصیتیں

ائمہ کرام مکمل انسان ہیں۔ وہ انسان جنہوں نے خلافت الہیہ [”اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً“، نفع الہی اور ”نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِی“] کے تمام امکانات کو عملی جامہ بخشا اور محقق و ثابت کیا ہے، وہ پروردگار کی خاص عنایت سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور مندرجہ ذیل امتیازات کے حامل ہوتے ہیں:

(۱) عصمت:

گناہ اور غلطی سے محفوظ ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نفس کے تابع ہوتے ہیں اور نہ اپنے کام میں کسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے برخلاف، جو ارتکاب گناہ پر قادر نہ ہونے اور عجز کی وجہ سے گناہ سے محفوظ رہتے ہیں، پیغمبر اور ائمہ اپنی طاقت و تسلط، اپنی فکر و نظر اور اپنے ایمان و یقین کے مراتب کی وجہ سے گناہ، غلطی اور اشتباہ کا ارتکاب نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ’محفوظ‘ ہونے کی ان دونوں کیفیتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ”ملک“ اور ”موجود ملک“ میں فرق ہو سکتا ہے۔

پیغمبر اور امام وجود انسانی کے کمال کی ان بلندیوں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں، جہاں ان کے لئے گناہ اور اشتباہ کا کوئی تصور ہی نہیں رہ جاتا۔ ہم ایک طبیب حاذق کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی مرض کی تشخیص میں کبھی کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ اب یہ ”نہ سکنے“ کا لفظ کیا یہ مفہوم رکھتا ہے اسے غلطی پر قدرت نہیں ہے؟ اگر وہ غلطی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا؟ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس فن میں اتنی مہارت اور دسترس رکھتا ہے کہ غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرشتوں کی عصمت اور انبیاء کی عصمت میں یہی فرق ہے۔ ایک کا ”(گناہ) نہ کر سکتا“ عاجزی کی وجہ سے ہے اور دوسرے کا ”(گناہ) نہ کر سکتا“ عاجزی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کمال، قدرت اور تسلط کی بنا پر یہ ملکہ

حاصل ہوتا ہے (جو خدا کا خاص لطف ہے)۔ وہ اتنے بلند ہیں کہ ان میں کسی طرح کا نقص سوچا ہی نہیں جاسکتا۔

عقلی نقطہ نظر سے پیغمبر و امام کی عصمت کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ نبوت اور امامت کی بنیاد عنایت و ”فضل“ خداوندی پر ہے، لہذا خدا اپنی عنایات و الطاف کو نبی اور امام کی صورت میں اپنے دین اور شریعت کو عوام تک پہنچاتا اور اس کی تبلیغ اور ترویج کا اہتمام کرتا ہے۔ عقلی نکتہ نگاہ سے لازم ہے کہ ان عنایات و الطاف کے تسلسل کو وہ برقرار بھی رکھے اور پیغمبر و امام کو ایسا رکھے کہ ان سے کبھی گناہ یا غلطی کے سرزد ہونے کا کوئی امکان نہ رہ جائے، ورنہ پوری انسانیت معرض گمراہی اور ضلالت کے دہانے تک پہنچ جائے گی۔ جو لوگ خدا کی طرف سے منتخب کر کے ہدایت اور رہبری عوام پر مامور کئے گئے ہیں، اگر وہی غلطی اور گناہ کے مرتکب ہونے لگیں پھر وہ کس طرح اعتماد کے قابل رہ جائیں گے۔ اس طرح عنایت و فضل الہی ناقص سمجھا جانے لگے گا۔ انسانی بلند کرداری اور ایمان اماموں میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ان سے ارتکاب گناہ اور اشتباہ غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہوں میں گناہوں کی خرابیاں بالکل واضح ہوتی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح اگر کسی انسان کو یہ معلوم ہو کہ یہ زہر سم قاتل ہے تو وہ اسے نہیں کھاتا

(۲) علم وہی:

امام چونکہ پیغمبر کی طرح براہ راست سرچشمہ فیضان علم الہی سے سیراب ہوتا ہے اور حواس و فکر و اندیشہ کے منابع کے علاوہ دیگر منابع پر بھی دسترس رکھتا ہے اسی وجہ سے، وہ پیدائشی طور پر خصوصی ملکات، خاص قوتوں اور حیرت انگیز استعداد، معنوی اور علم حضوری کا حامل ہوتا ہے۔ جو شخص نور آفتاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسے طلوع آفتاب کی اطلاع کسی اور سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امامت کی اس جہت کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر اماموں میں سے کوئی چھ سال یا

گیارہ سال کی عمر میں عہدہ امامت پر فائز ہو جاتا ہے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ گوارہ ہی میں نبی تھے اور اسی عالم میں انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان بھی کیا تھا، اسی طرح ائمہ بھی ہیں۔

(۳) بشری پہلو

ان تمام اوصاف علم لدنی و عصمت اور اللہ کی طرف سے رہبری کے باوجود امام بھی پیغمبر ہی کی طرح انسانوں ہی میں سے ہوتا ہے اور تمام لوازم بشریت کا حامل ہوتا ہے۔ (سوائے ان تمام نقائص کے جو ناقص بشریت کا نتیجہ ہیں۔) وہ مکلف ہوتا ہے، دوسروں کو جن باتوں کی نصیحت کرتا ہے خود بھی ان پر عمل کرتا ہے۔ دیگر مذاہب کے برعکس اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دین میں کسی وقت بھی انسان کو بلند کر کے خدا یا خدا کی عظمت کو گھٹا کر اسے انسانی سطح پر نہیں لایا جاتا اور اس بات کی تاکید ہے کہ انبیاء و ائمہ قالب انسانی میں روحانی رہبر ہیں، انسانیت سے خارج نہیں ہیں بلکہ حقیقتاً وہ دوسروں کے لئے نمونہ ہیں۔

پیغمبر، امام اور نوابغ میں فرق

بعض مغرب زدہ مسلمان مفکرین کوشش کرتے ہیں کہ پیغمبروں اور اماموں کو ”نوابغ“ کے عنوان سے پیش کریں لیکن یہ ایک زبردست غلطی ہے۔ پیغمبروں اور اماموں کو اس طرح پیش کرنا ان کے روحانی اور الوہی پہلو کو نظر انداز کرنا ہے۔ نوابغ وہ لوگ ہیں جو قوی عقل و فکر کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طریقے سے کوئی چیز بناتے ہیں، مگر امام اور پیغمبران تمام امتیازات سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ارادہ الہی کی تجلی اور قوی روحانی جنبہ کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ وہ ابدی سرچشمہ الہیہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام پر اس کا نزول نہیں ہوتا۔ مگر وحی کے بیان کرنے اور اس کی توجیہ و تشریح میں وہ خدا کے عطا کئے ہوئے ملکہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نابغہ ہمیشہ خطا اور غلطی کی زد پر رہتا ہے، لیکن امام اس سے محفوظ ہوتا ہے۔

لہذا جو لوگ ائمہ اور پیغمبروں کو ”عظیم انسان“ والے ترازو پر تولتے ہیں، درحقیقت ان کی روحانی اور خدائی منزلت کے منکر ہیں۔

رسالت، امامت اور ولایت کا کردار

امام معاشرے میں تین بڑے فریضے اور کردار ادا کرتا ہے:-

(۱) سیاسی و غیر سیاسی رہبری

(۲) معارف اسلامی کی توضیح و تشریح اور دین کا تحفظ

(۳) معنوی رہبری اور باطنی امامت

معاشرہ کی رہبری

(الف) امام کا سب سے بڑا فرض ”رہبری“ ہے اور ان کے اسی کردار کی مناسبت سے انہیں امام کہتے ہیں۔ امام اللہ سے تقرب کے معنوی راستے کے ذریعے معاشرے کی جانب آتا ہے اور اسے نظام الہی اور جادہ حق کی سمت ہدایت کرتا ہے وہ اجتماعی زندگی کو مشیت الہی کے سانچے میں ڈھالتا ہے قوم کی اجتماعی، سیاسی اور دینی رہبری کرتا ہے۔ اسلام میں حکومت اور ”کلیسا“ ”حکومت“ اور ”دین“ کے درمیان علیحدگی کا وجود نہیں ہے۔ امام دینی پیشوا ہونے کے ساتھ ہی دنیوی رہبر و سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اسلام میں حکومت نظام الہی کو رائج کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے ولایت و حکومت اسلامی کی زمام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے جو گناہ اور بھول چوک سے منجانب اللہ محفوظ ہوں۔ امام مسلمانوں کا ولی اور حاکم ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: {إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ} (مانندہ: ۵۵) قرآن کی رو سے امام کے احکام کی اطاعت واجب ہے: {أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ} (نساء: ۵۹)

فقط امام ہی حکومت کرنے کا حقدار ہے۔ اگر امام کو اس کا کردار ادا نہ کرنے دیا جائے تو

اس سے امامت ختم نہیں ہوتی کیونکہ امامت صرف سیاسی اور ظاہری رہبری میں منحصر نہیں ہے، بلکہ حقیقی رہبری، دعوت اور تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور ان تک روحانی فیوض و برکات کا پہنچانا ہے۔ امام قوم سے معنوی اور علمی اتصال کے ذریعہ رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری کو پہلے کی طرح انجام دیتا ہے۔

اسلامی حقائق و معارف کا بیان اور تحفظ

پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی معاشرے میں سب سے اہم شے محض سیاسی امور کا چلانا نہیں ہے، بلکہ تعلیمات اسلام اور دینی تہذیب کی تبلیغ اور معارف اسلامی کی ترویج و تشریح بھی ہے۔ اسلامی نظام کو پھیلانے اور اسلامی معارف و نظریات کی تشریح کی ذمہ داری وہی شخص لے سکتا ہے جو خدا کی جانب سے مقرر ہو، خدا کی طرف سے عصمت مآب ہو، کیونکہ اگر وہ گناہ یا بھول چوک سے محفوظ نہ ہوگا تو ربانی نظام میں تبدیلی اور تحریف کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ قرآنی آیات اور متواتر احادیث جیسے حدیث ثقلین اور حدیث سفینہ کی رو سے امامت و ولایت اسلامی تہذیب کا سرچشمہ اور علوم و معارف کا مرجع ہے۔ امام حقائق کو بے نقاب ملاحظہ کرتا ہے، وہ ادراک اور علم روحانی رکھتا ہے، دین کے باطنی مفہیم اور وحی کی گہرائیوں کو سمجھتا ہے اور تشریح کرتا ہے۔ (جناب خضرؑ کی باطنی امامت کا ایک نمونہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تفصیل سے درج ہے: ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَةَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا غَابِطِينَ﴾ (انبیاء: ۷۳)

پیغمبرؐ کی بعثت کے ساتھ اسلامی نظام کلی طور پر نازل ہو گیا، لیکن اس کی تشریح و توضیح و حفاظت اور نشر و اشاعت کی ضرورت ہے اور یہ کام امام کے ذمے ہوتا ہے۔ مشیت الہی کے آئینہ دار اور 'الراسخون فی العلم' کے مصداق افراد کے وجود کے بغیر، دین الہی تبدیلی، تحریف، فساد، انحطاط، جمود اور زوال جیسے خطروں کی زد میں ہے۔ ائمہ مکتب اسلام کی جامعیت کے محافظ، اس کے

شارح اور آخری آسمانی پیغام کے جہات، حقیقت اور اس کے اصول کے بچانے والے ہیں۔ اسلام کے وجود کی حفاظت کے لئے ائمہ، شرک، اوہام، جہالت اور انحراف سے نظریاتی و فکری جنگ کرتے ہیں تاکہ 'فساد' (بگاڑ) کو اسلام کے پیکر سے دور رکھیں۔ اہل بیتؑ کے علمی مرجعیت کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا مسلمانوں کی بد نصیبی ہے، جس نے بنی امیہ اور بنی عباس، یونان زدگی، اسرائیلیات، اتقاقی فکروں، مشرق پرستی اور مغرب زدہ پرستی اور یلغاری فکروں کو جہاں اسلام کے طرز فکر پر مسلط کر دیا اور اسلام پر کاری ضرب لگائی، لیکن اس کے باوجود ہزاروں حدیثوں کی برکت اور اماموں کے عظیم علمی مدارس کا فیض تھا کہ اسلام، خدا کے عطا کردہ اصلی خدوخال ساتھ تاریخ میں موجود ہے اور گذشتہ تحریف شدہ ادیان کے مقدر سے دو چار نہیں ہوا۔

(ج) امامت کی باطنی رہنمائی

امام کے کردار کو صرف سیاسی و سماجی رہبری حتیٰ کہ علمی کردار میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ دنیا والوں کے لئے فیض ربانی کا وسیلہ بھی ہے۔ امام باطن میں بھی رہبری کے عہدے کا حامل ہے اور خدا کی طرف انسانوں کی باطنی رہبری بھی کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی وجود صرف مادی، سماجی اور فکری پہلوؤں میں محدود نہیں ہے، بلکہ وجود کی ظاہری سطح کے نیچے روح کی تعجب خیز گہرائیاں ہیں۔ ظاہری زندگی سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جس کے نیچے ٹھٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود ہوتا ہے مگر ہم ان سے بے خبر بالائی سطح پر ہی ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو باطنی تزکیہ اور روحانی مقامات تک پہنچ چکے ہیں ان رموز سے واقف ہیں۔ امام ان مقامات پر بھی فیض ربانی کے وسیلے کی حیثیت سے نور برساتا اور انسانوں کی ہدایت کرتا ہے۔ بقول علامہ طباطبائی: (انسان فہمد یا فہمد درست مانند کودکی است کہ تحت تربیت قرار می گیرد) (۱) انسان سمجھے یا نہ سمجھے وہ ایک بچہ کی مانند ہے جس کی تربیت کی جارہی ہے۔ امام کے ان باطنی رخوں پر غور کر کے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ زمانہ غیبت میں امام کس طرح ہدایت کے فرائض انجام دیتا ہے۔

زندگی کے ہر دور میں ایک ایسے انسان کامل کی ضرورت ہے جو ولایت کی حقیقت کا حامل اور مخلوقات کے لئے فیضان الہی کا ذریعہ ہو۔ دنیا ان ہی کامل انسانوں کے دم سے قائم ہے۔ حدیث قدسی میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے جو کہا گیا ہے: ”لَوْلَا كَلِمَةٌ لَّمَّا خَلَقْتُ الْإِنْسَانَ“ (۱) (اگر آپ نہ ہوتے تو ہم زمین اور آسمان کو پیدا نہ کرتے) اس کا اشارہ حقیقت کی اسی گہرائی کی طرف ہے۔

کیوں ”امام“ یا ”ولی“ سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہنا چاہئے؟

اس طرح کوئی بھی دور، عنایت الہی کے ذرائع، معنوی نورانیت اور انسان کامل کے مصداق، ان ہستیوں سے کبھی خالی نہیں رہ سکتا، اسی وجہ سے انسانی معاشرہ ائمہ کے وجود سے کبھی بھی خالی نہیں رہ سکتا۔ ”لا تَخْلُو الْأَرْضَ عَنْ حِجَّةِ اللَّهِ“ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جو نظام عقائد و اعمال انسانوں کے لئے مہیا کیا ہے، وہ اور اسلام کے اصول و شریعت، باطنی حقائق اور روحانی کڑیوں پر استوار ہیں۔ آج کے فلسفہ کی اصطلاح میں ہر قانون یا ظاہری اصول کے پہلو میں ایک جوہر اور باطنی اساس موجود ہوتی ہے۔ نتیجتاً ہر زمانہ میں اسلام کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو باطنی پہلوؤں کو سمجھتے ہوں اور اس عالم کی سیر کرتے ہوں اور باطنی حقائق کا براہ راست مشاہدہ کرتے ہوں۔ یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق زمانہ غیبت امام عصر میں (فقیہ) اعلم و مراجع دینی کی باطنی طور پر رہنمائی فرماتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو ممداری انبیاء کے حوالے کی گئی ہے وہ ممکن ہے کہ البلاغ کے ذریعے مکمل ہو جائے، لیکن انسانوں میں اس پیغام کی حفاظت کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ چنانچہ زمانہ غیبت میں نیابت امام کی یہ ذمہ داری مجتہدین اور صاحب نظر و کردار فقہاء پر عائد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ”ولی فقیہ“ اس منصب پر فائز ہوتا ہے۔

(۱) حدیث میں آیا ہے: ”يَنْتَفِعُونَ بِوَلَايَتِهِ فِي غَيْبَتِهِ كَالنَّفْعِ بِالشَّمْسِ وَان تَجَلَّلَهَا سَحَابٌ“ (کمال

الدین، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۵۳)

زمانہ غیبت میں ولایت امامت

کیا زمانہ غیبت میں ولایت و رہبری کا سلسلہ کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور قوم اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی ہے اور کسی طرح کی ہدایت و رہبری کی ضرورت نہیں رہتی ہے؟ ایسا نہیں ہے، نہ ہی ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل کی رو سے رہبری، امت کو شکل دینے نظم و نسق اور حکومت اسلامی بنانے کی ضرورت ختم نہیں ہو سکتی اور ہر زمانے میں فوقیت کی حامل ہے۔

(۱) کسی معاشرہ کا وجود ہدایت، رہبری اور حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، خواہ اس حکومت کی بنیاد حق و صداقت پر مبنی ہو خواہ ظلم و استبداد پر (۱) اسلام بھی جو ایک جامع و مانع نظام ہے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ معاشرے پر ظالم اور مستحکم حکومت کا تسلط ہو جائے۔ امام معصوم کی غیبت اس ضرورت کو ختم نہیں کرتی ہے۔

(۲) شریعت اسلام کا سلسلہ کسی زمانے میں بھی منقطع نہیں ہوتا۔ فقہ اسلامی اور قوانین قرآنی کے موضوعات پر ایک طائرانہ نظریہ ثابت کرتی ہے کہ غیبت امام کے زمانہ میں بغیر ایک رہبر کے وجود کے ان میں سے بہت سے دستور و قوانین کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ غیبت کے زمانے میں احکام شریعت اور قرآن کا ۴/۳ معطل ہو جائے؟ مثلاً قرآن اور شریعت اسلام مالیاتی قوانین مثلاً انفال، خمس، زکوٰۃ، خراج (مفتوحہ زمینوں کا ٹیکس) احکام ذمی، مسلم، احکام دفاع طاقت کی آمادگی اور تدارک کا حصول، اسلام کا دفاع، حدود اسلامی کا تحفظ، مسلمانوں کے خون اور ناموس کی حفاظت اور ظالم کے مقابلے میں مظلوموں کی حمایت وغیرہ قوانین کا حامل ہے۔ (۲) اسی طرح قرآن اور فقہ کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ احکام جہاد، صلح، احکام قضا، قصاص اور حدود و دیات پر مشتمل ہے۔

(۱) امیر المؤمنینؑ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ”وَإِنَّهُ لَا يَدُلُّ النَّاسَ عَلَى مَا فِيهِ الشَّقَى“ (نَجِّ الْبَلَاءِ، خطبہ: ۴۰)

(۲) وَاعْدُوا لَهُمْ-----وَعْدُو كُمْ

بغیر اسلامی حکومت کے وجود اور رہبری کے تمام تر تعلیمات اسلام کی ترویج کس طرح ممکن ہے؟ اسلام ایک کامل دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور بقول بانی جمہور اسلامی آیۃ اللہ خمینی ”اسلام نے انسان کے لئے انعقاد و نطفہ کے پہلے سے موت کے بعد تک کے قوانین بنائے ہیں۔ جس طرح عبادت کے قوانین ہیں، اسی طرح اجتماعی قوانین بھی موجود ہیں“^(۱) لہذا ہر دور میں چاہئے کہ اجتماعی، اقتصادی، عدالتی اور سیاسی حکومت و نظام اپنے خاصہ کو برقرار رکھے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ غیبت کے زمانے میں بھی رہبری اور ولایت کی ضرورت بدرجہ اتم باقی رہتی ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام معصوم کے بعد مسلمانوں کی دینی اور دنیوی رہنمائی اور مرجعیت کیسی ہو اور زمام رہبری کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو؟ بے شمار نقلی اور عقلی دلائل کی رو سے غیبت کے زمانے میں اس رہبری کی ذمہ داری واقف ترین اور صالح ترین علما و فقہاء پر آتی ہے۔

احادیث و اقوال پیغمبر و ائمہ کی رو سے علما اور مستند صاحبان دانش و بینش کو محافظین دین، وارثان انبیاء اور جانشینان پیغمبر کے عنوان سے پہنچوایا گیا ہے۔ ذیل میں اس طرح کی چند حدیثوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

نقلی دلیلیں:

پیغمبرؐ سے منقول ہے: ”اللهم ارحم خلفای ثلاث مروت قبیل یا رسول الله ومن خلفائک؟ قال: الذین یاتون بعدی یروون حدیثی و سنتی ثم یعلمونہا“^(۲)

اس حدیث میں پیغمبرؐ نے سنت و حدیث کے ماہرین اور دین کے دانشوروں کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ پیغمبرؐ کا ارشاد ہے: ”الفقہاء امناء الرسول مالم یدخلوا فی الدنیا قبیل یا رسول الله ما دخولہم فی الدنیا قال اتباع السلطان فاذا فعلوا ذلک ما حذروہم

(۱) ’ولایت فقیہ از امام خمینی، ص ۱۰

(۲) وسائل الشیعیہ، ج ۱۸ ص ۶۵

علی دینکم“^(۱) یعنی فقہاء پیغمبروں کے امین ہیں جب تک کہ دنیا کے آگے سر نہ خم کریں۔ پوچھا کہ دنیا کے آگے سر جھکانے کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ظالم اور غیر اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا اور اگر وہ ان کاموں کو انجام دیتے ہیں تو ایسے علماء سے پرہیز کرنا چاہئے۔

امام زماں نے اسحاق ابن یعقوب کے پوچھے ہوئے چند مسائل کے جواب میں فرمایا: ”اما الحوادث الواقعة فارجعوا فیہا الی رواة احادیثنا و فانہم حجتی علیکم و انا حجة الله علیہم“^(۲) [اپنے روزمرہ کے مسائل اور روایات کے متعلق میری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو (جو اسلامی کتابوں پر گہری نظر رکھتے ہیں) کیونکہ تمہارے لئے وہ میری طرف سے مستند ہیں اور ان کے لئے میں خدا کی طرف سے مستند ہوں] یہ حدیث بھی ظاہر کرتی ہے غیبت کے زمانے میں مستند بالبصیرت دانشور اور مجتہدین ہر قسم کے مسائل میں مسلمانوں کی رہبری کا استحقاق رکھتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام نے بھی فرمایا ”اخذ الله علی العلماء ان لا یقارو علی ظلم ظالم ولا یسبغ مظلوم“^(۳) یعنی تبلیغ کی ذمہ داری، نظام اسلام کی حفاظت ظالم سے جنگ اور مظلوم کی حمایت مستند، صاحبان کردار و بینش علماء کے فرائض میں داخل ہیں۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ”ان العلماء ورثہ الانبیاء“^(۴) یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

”منزلة الفقیہ فی هذا الوقت کمنزلة الانبیاء فی بنی اسرائیل“^(۵) یعنی زمانہ غیبت میں فقہاء کا مقام بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہے۔

”ومن کان منکم قد روی حدیثنا و نظر فی حلالنا و حرامنا و عرف احکامنا فلیومنوا بہ حکماء وعلینا ردو الرد علینا الراد علی الله و هو علی حد

(۱) کافی، ج ۱ ص ۳۶: ان روایات کی بحث اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ’ولایت فقیہ از امام خمینی‘

(۲) کمال الدین، صدوق، ص ۸۳-۸۴ (۳) نہج البلاغہ

(۴) اصول کافی، ج ۱ (۵) عوائد راقی، ص ۱۸۶، حدیث

الشُرک باللہ“^(۱) یعنی تم میں سے جو دانشمند مسائل اسلامی اور میری حدیثوں کا درک رکھتا ہو اور احکام اسلام میں اجتہاد کا حامل ہو اس کے حکم کے آگے سر جھکاؤ ہم نے اسے تم پر ولی اور حاکم بنایا ہے، پس اگر ایسا فرد کوئی حکم دیتا ہے اور کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے سرتابی کا مرتکب ہوتا ہے اور ہمیں رد کرتا ہے پس جو ہمیں رد کرے وہ دین خدا کو رد کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہوتا ہے۔“

ان مستند احادیث و روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”ولایت فقیہ“ ناقابل تردید ہے اور غیبت امام کے زمانے میں مسلمانوں کی رہبری کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور اسلامی حکومت کا قیام، مکتب اسلام کی حفاظت اور ظلم و ظالموں سے مقابلہ کی ذمہ داری ختم ہونے والی نہیں ہے۔

ولایت فقیہ کا فلسفہ

عقلی نقطہ نظر سے ولایت فقیہ کا فلسفہ سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے:

دنیا میں مختلف طرز حکومت اور نظام رائج ہیں۔ استبدادی حکومت میں طاقت پر ایک فرد کا قبضہ ہوتا ہے۔ سلطنتی نظام میں شاہ کو (ظل الہی) سمجھا جاتا ہے اور عوام اس کے لئے الہی حق کے قائل ہوتے ہیں۔ اشرافیہ (Aristocracy) حکومت میں طبقہ اشراف حکمران ہوتا ہے۔ جمہوری (Democratic) طرز حکومت میں عوامی طرز کی ہوتی ہے۔ صرف عوام کی رائے ہی حاکم اور کرتا دھرتی ہوتی ہے۔ (البتہ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت اور فریب کی حکمرانی ہوتی ہے)۔ عیسائی معاشرے میں کلیسا کی حکمرانی ہے۔ ان تمام سیاسی نظاموں کے مقابلے میں اسلام نے شرعی حکومت پیش کی ہے، اس لئے ہم اسلامی نظام کو ایسے قانونی یا دستوری حکومت کا نام دے سکتے ہیں جس میں صرف قانون شریعت اور ارادہ الہی حاکم ہے یہاں تک کہ پیغمبر اور امام بھی اسی کے تابع ہیں۔

جمہوریت میں عوامی نمائندے حاکم ہوتے ہیں، اشریت میں طبقہ اشراف کے نمائندے حکمران ہوتے ہیں۔ کلیسائی حکومت میں کلیسا، پوپ اور بشپ وغیرہ کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قانونی اور دینی حکومت میں کن لوگوں کی حاکمیت ہونا چاہئے؟ جواب ظاہر ہے۔ اس نظام حکومت میں حکومت کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے جو اس قانون اور اس نظریہ کے خصوصی ماہر اور اس دین و مذہب کے مستند دانشمند ہوں۔ یہی عقلی اور منطقی فیصلہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غیبت کے زمانے میں بھی اسلامی معاشرے میں ”ولایت“ اور ”رہبری“ کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور مستند و صاحب فکر و کردار علماء، اماموں کی تہذیب کے وارث، حکومت اسلامی اور حق و باطل کے جنگ کے علم بردار ہیں۔ امت اسلامی پر واجب ہے کہ ان کی اطاعت کرے اور ان کے پرچم کے تلے یکجا ہو کر اسلام مخالف قوتوں کے خلاف بے جگری سے نبرد آزما ہو اور ساری دنیا میں اسلامی حاکمیت کا جھنڈا گاڑ دیں۔

حیاتِ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام

۱- حضرت علی: ایک ہمہ جہت

(بहुमुखी/Multidimensional) شخصیت

اسلام ایک ہمہ جہت اور توحیدی دین ہے۔ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو دین و دنیا، روحانیت و مادیت، جسم و روح، معاش و معاد، مذہب و سیاست اور عرفان و انقلاب کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ اس میں 'عرفان' بھی ہے اور عدالت و آزادی بھی، عبادتی پہلو بھی ہے اور سیاسی و اجتماعی و اقتصادی و تکنیکی پہلو بھی۔ اسلامی نقطہ نظر سے مثالی انسان وہ انسان ہے جو ہمہ جہت ہو نہ کہ ایک سمت میں محدود۔

حضرت علی علیہ السلام ہمہ جہت انسان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ وہ اسلام اور توحیدی بصیرت کی سچی تصویر ہیں۔ انہوں نے دین محمدی کی جامعیت کے معجزہ کو اپنے حیات میں بڑے محسوس کئے جانے والے انداز میں پیش کیا ہے۔ علیؑ مذہب و سیاست کے مالک ہیں، عرفان، انقلاب، محراب، میدان جہاد، شمشیر، قلم اور منبر کے آدمی ہیں۔ وہ عرفان، عدالت اور آزادی کا مجسمہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر شریعتی..... ”علیؑ میں سب سے زیادہ نمایاں ان کی ہمہ جہت روح ہے، ایسی روح جو مختلف پہلوؤں حتیٰ کہ متضاد پہلوؤں کے لحاظ سے سورما (Hero) ہے۔ وہ طرز فکر، جنگ، عشق، محراب، انسانیت، عرفان اور سیاست کے ہیر و اوران تمام پستیوں اور انسانیت کے دلوں میں پل رہی برائیوں کے سخت دشمن تھے، جنہوں نے انسانیت کو دکھ اور درد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان کا دل اقدار انسانیت سے مملو رہا۔“^(۱)

علیؑ ہمہ جہت روحانی حیثیت کے حامل ہیں۔ ایک جانب تو وہ عرفان کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں، عارفوں کے امام اور اہل باطن کے قطب الاقطاب ہیں۔ دنیائے اسلام میں تصوف و عرفان کا کوئی سلسلہ نہیں ہے جس کی انتہا علیؑ پر نہ ہو؛ دوسری جانب وہ ایک بڑے عدل پسند ہیں۔ دنیا کے ہر انقلابی سے بڑھ کے انقلابی ہیں۔ عرفان کی معراج کمال تک پہنچنے کے بعد بھی سماجی مشکلات نیز کمزوروں کے سلسلے میں حساس ہیں۔ اگر علیؑ ایک طرف اسلام میں منشاء عرفان ہیں تو دوسری طرف ان کی تمام زندگی جہاد، معرکہ آرائی اور نبرد آزمانی سے بھری ہوئی ہے۔

میدانِ عمل کے ہر معرکہ کے ایسے بے مثال مجاہد اور صاحبِ ذوالفقار ہیں، ساتھ ہی ساتھ کشورِ علم میں ایسی بلندی پر فائز ہیں کہ پیغمبرؐ انھیں 'بابِ شہرِ علم' کا لقب عطا کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ اپنے مشہور و معروف خطبہ شمشیر میں خود فرماتے ہیں: ”يُنَحِّدُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَزْفِي إِلَيَّ الطَّيْرُ“ یعنی میرے وجود کے کوہِ سار سے فہم و دانش کے چشمے ایلے ہیں اور کوئی پرندہ میری ہستی کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

وہ گہری نظر کے صاحبِ حکمت ہیں، ایک شعلہ بیان خطیب ہیں، علیؑ ایک لائق سیاست داں اور عظیم مملکتِ اسلامی کے فرمانروا ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک محنت کرنے والے مزدور ہیں جو کھیتوں میں سینچائی اور کنویں کھودنے کا کام کرتے ہیں۔ وہ ایک بہادر کمانڈر اور مضبوط سپاہی ہیں۔ کافروں کا کوئی خاندان ایسا نہیں جس نے ان کے آبِ دم شمشیر کا مزہ نہ چکھا ہو۔ اس کے باوجود ایک مہربان سرپرست اور نرم دل کے مالک ہیں۔ ایسے نرم دل کہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر اشکبار ہو جائیں۔ اگر دن کے وقت بیشہ شجاعت کے شیر ہیں تو رات کے وقت ایک عابدِ شب زندہ دار۔ میدانِ جنگ میں شیر کی طرح ہیں تو رات کو محرابِ عبادت میں جسم پر ریشہ اور آنکھیں اشکبار ہیں، ایک سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر متعصب قاضی بھی ہیں۔

علیؑ اسلام کے ہر رخ کی مکمل تصویر ہیں۔ حاملِ کتاب بھی ہیں (یعنی علم و حکمت میں ”الزَّائِسْخُونُ فِي الْعِلْمِ“)، میزان (عدالت) بھی اور آہن (شمشیر) بھی، علیؑ پیکرِ عرفان ہیں،

مجسمہ عدالت ہیں، آزادی کے محافظ ہیں۔ ان کی شمشیر خون کے دریا بہاتی ہے اور ان کے دل سے محبت کے چشمے ابلتے ہیں۔ ظالم و جابر کے مقابلے میں طوفان کی حیثیت رکھتے ہیں اور مظلوم کے لئے پنکھڑی کی طرح نازک ہیں۔

امیر المومنینؑ مجموعہ صفاتِ کمال بھی ہیں اور جامع اضداد بھی۔ تمام اقوام و ملل میں جتنی بھی تاریخی شخصیتیں گذری ہیں ان کے کمال اور صلاحیتیں مختلف میدانوں میں اجاگر ہوئی ہیں یعنی جو فکر میں یکتائے روزگار تھے وہ صاحب شمشیر نہ تھے، جو عظیم فرمانروا تھے وہ عاقبت اندیش نہ تھے، معروف حکماء اہل سخن نہ تھے، اور جنہیں برجستگی سخن میسر تھی ان کے تفکر میں گہرائی نہ تھی مگر ان کے برعکس علیؑ کی شخصیت ہر رخ سے تاباں نظر آتی ہے۔

قرآن حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوت کا معجزہ ہے اور علیؑ ان کی آغوش کا معجزہ ہیں۔ علیؑ پیغمبرؐ اور اسلام کی حقانیت کے ایک عظیم شاہد ہیں اور ایسے جامع کمالات ہو کر علیؑ اعلان کرتے ہیں ”اَنَا عَبْدُكَ وَابْنُ عَمَّتِكَ“ یعنی میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔“

۲- حضرت علیؑ کے ادوار زندگی کی تقسیم

جیسا کہ بعض معاصر اسلامی مفکرین نے اشارہ کیا ہے امیر المومنینؑ کی زندگی کو تین ادوار پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور: بچپن سے وفاتِ پیغمبرؐ تک، یہ دور انقلابِ اسلامی کی فتح کے لئے جہاد اور دین کی تکمیل پر مشتمل ہے۔

دوسرا دور: وفاتِ پیغمبرؐ سے قبولِ خلافت تک، یہ دور مسلمانوں کے اتحاد اور اسلام کی حفاظت کے لئے ۲۵ سال کی خاموشی کے طویل وقفہ پر مشتمل ہے۔

تیسرا دور: قبولِ خلافت سے شہادت تک، یہ دور پانچ سال کا ہے اور قیامِ عدالت اور نظامِ اسلام کو قائم اور جاری رکھنے کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔

پہلا دور علیؑ پیغمبرؐ کے ساتھ

حضرت علیؑ بچپن سے ۱۱ھ میں پیغمبرؐ کی وفات تک جس میں دور بعثت کے ۲۳ سال تک شامل ہے، پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ رہے۔ وہ پیغمبر اسلامؐ کے دستِ راست، ان کے وزیر، وصی، مشیر اور یار و ناصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ صلح ہو یا جنگ، رزم ہو یا بزم، علیؑ ہر آن پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ تھے اور پیغمبرؐ کے اصحاب میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ شیعہ، سنی، جعفری، زیدی، حنبلی، حنفی، مالکی اور شافعی تمام حدیثی اور تاریخی ذرائع نے مذکورہ آزمائشی دور میں متفقہ طور پر حضرت علیؑ کے امتیازات، ان کی جاں نثاریوں اور عظیم کارناموں کو بیان کیا ہے۔ علیؑ قیامِ دین کے لئے ہمیشہ سربکف میدان میں آئے ہیں۔

مندرجہ ذیل صفحات میں حضرت علیؑ کے کارہائے نمایاں، امتیازات، بلندی اور فضائل کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔ اس وقت کا جائزہ جب دین اپنے ابتدائی مراحل میں تھا، امت مستحکم نہ تھی اور دین الہی کا پھیلانے والا ابھی موجود تھا۔ اہلسنت کے معتبر ترین منابع و مآخذ سے ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت علیؑ کی تحفظِ دین اور قیامِ مذہب کے لئے تمام کاوشوں اور کارہائے نمایاں کے سلسلے میں مسلمانوں کے کسی فرقہ میں کوئی اختلاف نہ تھا اور سب اس مسئلہ پر متفق الرائے تھے کہ علیؑ کی زندگی کا پہلا دور جو ۲۳ سال پر مشتمل ہے، دین کے قیام اور اس کے دفاع میں گذرا۔ یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ یہ حصہ آیت اللہ سید علی نقی نقوی صاحب کی اس مفصل تحقیق کا نچوڑ ہے جو پاکستان میں ”خلافت و امامت“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔

علیؑ نے اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت حاصل کی

تاریخی تحقیق میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میدان میں کس کو برتری حاصل ہے۔

حضرت علیؓ (جب کہ ابوطالبؓ کی وفات کے بعد پیغمبر علیؓ کے مربی تھے) اسلام کے حلقہ بگوش نہ ہوں اور غلاموں میں سے پانچ افراد جن کا نام بھی لوگ نہیں جانتے تھے، وہ مسلمان ہو جائیں!!!

اس احاد ضعیف اور ناقابل قبول روایت کے مقابل میں ایسی روایتیں کثرت سے ملتی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت علیؓ سب سے پہلے شخص تھے جو اسلام لائے۔

تاریخ وحدیث کی ابتدائی کتابوں کو دیکھنے کے بعد علیؓ کے سابق الایمان ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ خود پیغمبرؐ سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”علیؓ پہلے شخص ہیں جو ہم پر ایمان لائے۔“ اس روایت کو احمد نے عمر سے، طبرانی نے سلمان سے، عقیل نے براء ابن عاذب سے اور دوسری جگہ احمد و طبرانی نے معتل بن یسار سے، دارقطنی نے ابوسعید خدری سے، دیلمی نے سعد، ابوسعید ام سلمہ، جابر اور اسماء بنت عمیس سے، حاکم نے معاذ سے، عقیل نے عائشہ سے، ابن اسامہ نے سلمان سے اور ابونعیم نے معاذ سے نقل کیا ہے۔

پیغمبرؐ کے مذکورہ بالا قول کے علاوہ اصحاب کے اقوال بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدیجہ اور علیؓ کے علاوہ کوئی دوسرا اسلام لانے پر سبقت نہیں رکھتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نسائی، ترمذی، طبرانی، حاکم اور ابن جریر نے عبداللہ بن عباس سے، طبرانی نے جابر سے، عبدالبر نے ابن عباس، سلمان، ابوذر، مقداد، زید ابن ارقم، جابر اور ابوسعید خدری سے، حاکم نے ابوموسیٰ سے، زید ابن ارقم، امام شافعی، امام احمد، ترمذی نے حکم بیہقی سے، ابن عبدالبر نے زید ابن ارقم سے، امام ابو حنیفہ، احمد، نسائی حاکم اور ابن سعد نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ خدیجہؓ کے علاوہ علیؓ تھے جو اسلام لائے تھے۔ ان روایات کو ترمذی حاکم، ابن عبدالبر، ابوجعفر طبری، ضیا مقدسی اور ابن حجر نے صحیح کی ممتاز قسموں میں شمار کیا ہے۔ ارباب نظر اچھی طرح جانتے ہیں کہ اتنی کثرت سے صحیح روایتوں کے مقابلہ میں ان دو ضعیف، مجروح، سقیم اور مخدوش روایتوں کی تحقیقی اور علمی اعتبار سے کیا حیثیت ہے؟

دعوت ذوالعشیرہ

علیؓ کی پہلی فضیلت (ایمان کے اعلان میں سبقت) اس وقت ظاہر ہوئی جب پیغمبر اسلامؐ

پوشیدہ اور رازدارانہ طور پر تبلیغ اسلام اور مشرکوں اور ظالموں کے خلاف نبرد آزما کر رہے تھے۔

اس کے بعد پیغمبرؐ تک خدا کا حکم پہنچا کہ اسلامی انقلاب کے پوشیدہ معرکے کو نیم اعلانیہ مرحلے میں تبدیل کر دیا جائے اور اس مناسبت سے آیت بھی نازل ہوئی {وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ} (شعراء/ ۲۱۴) ”اپنے قبیلہ اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں انہیں اسلام کی دعوت دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیغمبرؐ نے اس حکم الہی کی بنا پر اپنے اعزہ و اقرباء اور دودمان بنی ہاشم کے افراد کو بلایا تاکہ ان کے کانوں تک خدا کا پیغام پہنچایا جائے اور بڑے ہی پر اعتماد لہجہ میں فرمایا:

يا بنی عبدالمطلب انی واللہ ما أعلم شاباً فی العرَبِ جاء قومہ بافضل مما قد جئتکم انی قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی اللہ تعالیٰ ان اذعنوکم اللہ فایکم یواذنونی علی هذا الامر علی ان یکون اخي وصی و خلیفتی فیکم۔

اے فرزندان عبدالمطلب! یقیناً جانے میں عرب کے کسی ایسے جوان کو نہیں جانتا جو اپنی قوم کے لئے اس چیز سے بہتر کوئی چیز لایا ہو جو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ میں تمہارے لئے دین و دنیا کی فلاح و بہبودی لایا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں خدا کی طرف دعوت دوں۔ اس امر پر تم میں سے کون ہے جو میری مدد کا وعدہ کرے گا، وہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہوگا۔ ان باتوں کو سن کر مجلس میں خاموشی چھا گئی، سب خاموش تھے یہاں تک کہ علیؓ رشادت و اطمینان سے کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے فرمایا: ”انا یابن نبی اللہ ان اکون وزیرک علیہ“ ”اے پیغمبر خدا میں آپ کی نصرت و مدد کے لئے حاضر ہوں۔“ اس کے بعد پیغمبرؐ نے مسرت آمیز لہجہ میں اعلان فرمایا:

”ان هذا اخي وصی و خلیفتی منکم فاسمعوا له واطیعوا“ ”آگاہ ہو جاؤ کہ تمہارے درمیان یہ میرے بھائی، وصی اور خلیفہ ہیں تم ان کی باتوں کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔“

یہ واقعہ صف اول کے مندرجہ ذیل ماخوذوں میں درج ہے:-

مسند احمد ابن حنبل، سیرۃ ابن اسحاق، خصائص نسائی، تاریخ طبری، تاریخ ابوالفداء

جانبازی کا عہد و پیمان کیا تھا، اسے کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ وہ سرفروشی اور فداکاری کو ظاہر کرنے کے لئے نبیؐ کے بستر پر ان کی سبز چادر اوڑھ کر اطمینان سے سو گیا اور پیغمبرؐ نے بڑے اطمینان سے ہجرت کی۔ قسطلانی کا بیان ہے کہ ”فَكَانَ أَوَّلُ مَنْ شَرَى نَفْسَهُ“ علیؑ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے نفس کو بیچا اور اپنے کو معرض خطر میں ڈال دیا۔“ (مواہب الدینیہ، ج/۱، ص/۷۸)

امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ اس موقع پر علیؑ کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی: {وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَئِىٌّ بِالْعَبَادِ} (بقرہ/۲۰۷) (تاریخ نمیس، ج/۱، ص/۳۶۸)

اکثر مورخین نے وضاحت کی ہے کہ پیغمبرؐ نے ہجرت کے بعد علیؑ کو اس لئے مکہ میں چھوڑا کہ آپ ان امانتوں کو لوٹا دیں جو پیغمبرؐ کے پاس لوگ رکھ گئے تھے۔

(ملاحظہ فرمائیں: تاریخ ابوالفداء ج/۱، ص/۱۲۶، کامل ابن اثیر، ج/۲، ص/۳۹)

ہجرت سے متعلق واقعات کو مسلمانوں کے صف اول کی جن تاریخوں اور اہل سنت حضرات کی معتبر تحریروں نے محفوظ کیا ہے ان میں سیرۃ ابن اسحاق، تاریخ طبری، صحیح حاکم، مسند احمد ابن حنبل، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور خصائص نسائی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

علیؑ: پیغمبرؐ کے معنوی بھائی

مدینہ پہنچنے کے بعد پیغمبرؐ نے مہاجر و انصار کو آپس میں بھائی بنایا۔ یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ معنوی اور روحانی برادری انہیں دو افراد کے درمیان قائم ہوتی ہے جو خصوصیات اخلاق اور عادات و فضائل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہوں۔

چنانچہ پیغمبرؐ نے اس موقع پر حمزہ کو زید ابن حارثہ کا، عثمان کو عبدالرحمن ابن عوف کا، زیاد کو ابن مسعود کا، عبیدہ ابن حارث کو بلال کا، معصب ابن عمیر کو سعد ابن وقاص کا، ابوعبیدہ جراح کو سالم کا، مولیٰ ابی خذیفہ اور سعید ابن زید کو طلحہ کا بھائی اور علیؑ کو پیغمبرؐ نے اپنا بھائی بنایا۔ اس سلسلہ میں

مشہور مورخ ابوالفداء لکھتا ہے:

أَخِي رَسُولُ اللَّهِ فَاتَّخَذَ رَسُولُ اللَّهِ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ أَخًا وَكَانَ عَلِيٌّ يَقُولُ عَلِيٌّ مِنْبَرُ الْكُوفَةِ أَيَّامَ خِلَافَتِهِ، أَنَا عَبْدُ اللَّهِ وَأَخُو رَسُولِ اللَّهِ۔

آنحضرت نے اپنے اصحاب کے درمیان مواخات قرار دی اور علی ابن ابی طالب کو اپنا بھائی بنایا علیؑ اپنی خلافت کے زمانہ میں منبر کوفہ پر فرماتے تھے کہ میں بندہ خدا اور رسول کا بھائی ہوں۔ (تاریخ ابوالفداء ج/۱، ص/۱۲۷)

ایک دوسرے موقع پر بھی پیغمبرؐ نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا مگر علیؑ کو اپنا بھائی بنانے کے لئے مخصوص فرمایا۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے کہ ”أَخِي رَسُولُ اللَّهِ بَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ ثُمَّ أَخِي بَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَقَالَ فِي كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا لِعَلِّي أَنْتَ أَخِي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“

”رسول خدا نے ایک مرتبہ مہاجرین کے درمیان اور دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ اخوت کا اعلان فرمایا اور ہر بار آپ نے علیؑ سے فرمایا کہ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔“ (استیعاب، ج/۲، ص/۳۷۳)

یہ واقعہ مندرجہ ذیل کتابوں میں بھی موجود ہے۔ صحیح ترمذی کتاب المناقب ص ۲۰، سنن احمد ابن حنبل ج/۳، ص/۱۵۳، ۱۹۰، ۲۰۴، ۲۷۱، نسائی نکاح، ۸۴، بطرانی وابن عساکر۔

۲۔ ہجری

جنگ بدر جو ۲ھ میں ہوئی تاریخ اسلام کی پہلی جنگ ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ اسلحہ اور جنگی ساز و سامان بھی نہیں کے برابر تھے۔ میدان جنگ سے تھوڑے فاصلہ پر پیغمبرؐ کے لئے ایک ایسی جگہ بنائی گئی جہاں سے وہ محاذ جنگ کے حالات کا جائزہ لیں اور فوج کی حرکات و سکنات کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس جگہ کو ”عریش“ کہتے ہیں۔

اس جنگ میں معدودے چند افراد ہی نے بہترین نبرد آزمائی کا ثبوت دیا۔ ان میں سے پیغمبرؐ کے اعزاء جیسے حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب، عبیدہ ابن حارث اور علیؑ سب سے نمایاں تھے۔ عبیدہ اس جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور علیؑ نے بہت سے سربرآوردہ کفار کو تیغ کیا۔

(تاریخ ابوالفداء، ج ۱، ص ۱۲۹)

اسی سال پیغمبرؐ نے علیؑ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا اور اپنی چہیتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کو علیؑ کے حوالہ عقد میں دیا جب علیؑ نے خواستگاری کی تو پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا ”قد امرنی ربی بذالک“ ”خدا نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔“ عقد کے بعد حضرت نے جناب سیدہؑ سے فرمایا ”أَقَاتُوا ضِينَنَا فَاطِمَةُ إِنَّ اللَّهَ اخْتَارَ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ رَجُلَيْنِ جَعَلَ أَحَدَهُمَا أَبَاكَ وَالْآخَرَ بَعْلَكَ“ ”اے فاطمہ! گویا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ خدا نے دنیا کے تمام لوگوں میں سے دو افراد کو منتخب کیا ان میں سے ایک کو تمہارا باپ اور دوسرے کو تمہارا شوہر قرار دیا۔“ (ریاض النضرہ، ج ۲، ص ۱۸۲) اس سے پتہ چلتا ہے یہ شادی فقط پیغمبرؐ سے علیؑ کی قرابت کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ اس رشتہ کا سبب خدا کا صریح حکم اور علیؑ کی ذاتی فضیلت ہے۔

۳۔ ہجری کی جھلکیاں

۳۔ ھ میں جنگ احد واقع ہوئی۔ یہ جنگ ایسی شدید، فیصلہ کن، اور تقدیر ساز تھی کہ مشیت الہی نے اسے مسلمانوں کا معیار عزم و ثبات قرار دینا چاہا۔ آغاز جنگ میں حالات امید افزا تھے۔ اس لئے کہ علیؑ نے فوج مخالف کے علمدار طلحہ بن عثمان کو قتل کر دیا تھا دشمن جنگ کی ابتدائی کامیابی کو اپنے ہاتھوں سے کھو چکے تھے اور ہار مان کر فرار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن کفار جب بھاگنے لگے تو کچھ مسلمان مال غنیمت کی لالچ میں پڑ گئے۔ خالد بن ولید جس نے اس وقت تک اسلام نہیں قبول کیا تھا، پیچھے سے حملہ کر کے مسلمانوں کو غافل کر دیا۔ ناظرین اس کے نتیجہ کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی زبانی سماعت فرمائیں۔ مدارج النبوة میں آپؐ تحریر فرماتے ہیں۔

”مسلمان شکست سے دو چار ہوئے اور انہوں نے پیغمبرؐ کو تنہا چھوڑ دیا۔ حضرت غضبناک ہوئے پسینہ کے قطرے آپؐ کی مقدس پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔ ایسے عالم میں آپؐ نے دیکھا کہ علیؑ آپؐ کے پہلو میں کھڑے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں سے کیوں نہ جا ملے یعنی تم نے کیوں فرار نہیں کیا۔ علیؑ نے فرمایا: ”أَكْفَرُ بَعْدَ الْإِيمَانِ إِنَّ لِي بِكَ أَسْوَأَ“ (کیا میں ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاؤں۔ میں تو آپؐ کی اقتدار کر رہا ہوں۔) مجھے یاروں سے کیا سروکار اتنے میں کچھ کفار آنحضرتؐ کی طرف متوجہ ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ مجھے ان سے بچاؤ اور حق خدمت ادا کرو یہ وقت نصرت ہے۔ علیؑ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسی جنگ کی کہ بہت سے افراد کو واصل جہنم کیا بقیہ افراد تتر بتر ہو گئی بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز علیؑ کے جسم مبارک پر سولہ زخم لگے تھے۔

۵۔ ہجری کے واقعات پر ایک نظر

۵۔ ھ میں جنگ خندق ہوئی۔ میدان جنگ میں عمرو ابن عبدود جیسا پہلوان موجود تھا اور رجز خوانی کر رہا تھا۔ کس میں ہمت تھی جو اپنے کو موت کے منہ میں جھونک دے۔ تاریخ مندرجہ ذیل الفاظ میں اس موقع کی منظر کشی کرتی ہے:

”طلب المَبَارَزةَ وَالْأَصْحَابِ سَاكِنُونَ كَأَنَّمَا عَلَي دُرُوسِهِمُ الطَّيْرُ لَا تَنَهُمُ كَانَ يَغْلَمُونَ شُجَاعَتَهُ“ ”وہ اپنا مقابل طلب کر رہا تھا اور سارے افراد ساکت تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے سروں پر طائر بیٹھا ہو۔ اگر وہ اپنا منہ بھی کھولیں تو پرندے اڑ جائیں اس لئے کہ وہ دشمن کی بہادری سے واقف تھے۔“ (تاریخ خمیس، ج ۱، ص ۷۴)

امیر المؤمنینؑ نے مسلمانوں کی آبرو بچالی۔ آپؐ اس کی پہلی ہی آواز پر مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔ پیغمبرؐ نے پہلے تو اجازت نہیں دی لیکن جب یہ دیکھا کہ مجمع پر مستقل سکوت چھایا ہوا ہے اور عمرو بن عبدود کی ڈینگیں بڑھتی جا رہی ہے، تب انہوں نے علیؑ کو اجازت دی اور بالآخر علیؑ ہی

کی تلوار تھی جس نے جنگ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کیا۔ (تاریخ خمیس، ج ۱، ص ۵۴)

صلح حدیبیہ

۶ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ پیغمبرؐ ظاہر آج کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے لیکن مشرکین نے حج نہیں کرنے دیا تو پیغمبرؐ خاص شرطوں کے ساتھ صلح کرنے اور پلٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس صلح کی شرطوں کو لکھنے والے علیؑ تھے۔

۷ھ ہجری کے واقعات

۷ھ میں جنگ خیبر واقع ہوئی۔ اتفاقاً امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ اسی وجہ سے آپ مدینہ میں تشریف فرما تھے قلعوں میں سب سے مضبوط اور مستحکم قلعہ جو دشمن کی پناہ گاہ بھی تھا، وہ قلعہ خیبر تھا۔

خیبر میں مسلسل تین دن تک مسلمانوں کی شکست کے بعد چوتھے دن پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا:

”أَمَّا وَاللَّهِ لَا عَظِيمَ الزَّايَةِ عَذَّارَ جَلَا كَوَارِأَ عَيْنِزَ فَوَارٍ يَحِبُّ اللَّهُ وَرَسُولُهُ يَفْتَحُ اللَّهُ عَلَى يَدِهِ“ (خدا کی قسم کل ہم اس کو علم دیں گے جو مرد (شجاع) ہے، کرار، فرار کرنے والا نہیں ہے، خدا اور اس کے پیغمبرؐ کو دوست رکھتا ہے، خدا اور پیغمبرؐ بھی اس کو دوست رکھتے ہیں۔ خدا اس کے ہاتھوں پر کامیابی عطا کرے گا۔) (خصائص نسائی، ص ۱۱، تاریخ خمیس، ج ۲، ص ۵۲، استیعاب، ج ۲، ص ۳/۴، الریاض النضرۃ، ج ۳، ص ۱۸۷)

بعض روایتوں میں ”کرار غیر فرار“ نہیں ہے جیسے صحیح بخاری، ج ۳، ص ۲۳، طبقات ابن سعد، ص ۸۰، لیکن دوسرے مستند ماخذوں جیسے، ابن اسحاق، نسائی، احمد ابن حنبل (مسند طبری (تاریخ)، طبرانی، بیہقی اور صف اول کے تمام علماء و محدثین و مورخین نے اس جملہ کو لکھا ہے۔

دوسرے دن پیغمبرؐ نے علم کو جھٹکا دیا اور فرمایا: ”اس علم کو کون لے گا؟“ اس کے بعد آپ

نے فرمایا: ”علیؑ تم لو، علیؑ نے علم کو سنبھالا اور قلعہ کو فتح کر کے کامیاب و کامران پلٹے۔

۸ھ ہجری کے واقعات پر ایک نظر

۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ تمام مسلمان خوشی کا جشن منانے میں مشغول تھے لیکن صدر اسلام کے معاشرے کے دو ممتاز شخصیتیں یعنی پیغمبرؐ و علیؑ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔ دونوں ہی خانہ خدا کو بتوں سے پاک کرنے میں مشغول تھے۔ پیغمبرؐ نے سب سے بڑے بت کو توڑنے کے لئے علیؑ کو اپنے کاندھے پر سوار کیا علیؑ نے اس بت کو توڑ کر گرایا۔

مشہور مورخ اہل سنت دیار بکری تحریر فرماتے ہیں کہ اس وقت پیغمبرؐ نے علیؑ سے کہا: ”طُوبَى لَكَ تَعْمَلُ الْحَقَّ وَطُوبَى لِي أَحْمِلُ الْحَقَّ“ (علیؑ تم کو مبارک ہو تم حق کے لئے یہ کام انجام دے رہے ہو اور مجھے بھی مبارک ہو کہ میں نے حق کا بوجھ اٹھایا یعنی حق کے لئے تم کو اپنے کاندھے پر سوار کیا ہے۔) (تاریخ خمیس، ج ۲، ص ۹۵)

ممکن ہے کوئی خیال کرے کہ یہ بہت ہی چھوٹے مسائل ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے مگر حقیقتاً انہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے تاریخ بنتی ہے اور ایک محقق کے لئے بظاہر یہی چھوٹے چھوٹے واقعات حقیقت تک پہنچانے میں شمع راہ بن جاتے ہیں۔ انہیں کے سہارے وہ علمی جستجو اور صحیح نتیجہ نکالنے میں مدد حاصل کرتا ہے۔

۸ھ کے آخر میں جنگ حنین واقع ہوئی۔ یہ وہ آخری جنگ تھی جس میں پیغمبرؐ نے شرکت کی۔ پیغمبرؐ کی زندگی میں اس جنگ کے بعد فقط جنگ تبوک تھی جس میں آپ بغیر شرکت کے واپس پلٹ آئے تھے۔

جنگ حنین میں پیش آنے والے اتفاقات بہت ہی حیرت انگیز اور افسوس ناک ہیں۔ قرآن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں جنگ کی منظر کشی کی ہے:

{وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ

الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّذَبِّرِينَ { (توبه/ ۲۵)

”جنگ حنین کے دن کو یاد کرو جس دن تم کو تمہاری کثرت نے مغرور کر دیا تھا لیکن اس سے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم جنگ سے فرار کر گئے۔“

حادثہ یہ پیش آیا کہ مخالف لشکر نے جو کمین گاہ میں چھپا ہوا تھا اچانک حملہ کر دیا اور مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے۔ آٹھ آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی میدان میں باقی نہیں بچا۔ محدث ابن ابی شیبہ کہتے ہیں: ”پیغمبرؐ کے ساتھ صرف چار اشخاص رہ گئے تھے تین افراد بنی ہاشم کے یعنی علی، عباس جو پیغمبرؐ کے ساتھ تھے اور ابوسفیان جو گھوڑے کی لجام پکڑے ہوئے تھے اور ابن مسعود پہلو میں۔ دشمنوں میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو پیغمبرؐ کی طرف بڑھا ہو اور قتل نہ کیا گیا ہو۔“ (طبری، ج ۲/۲، ص ۱۲۹)

”استیعاب“ میں عباس کے حالات کے بیان میں لکھا ہے: ”جنگ حنین میں سب فرار کر گئے سوائے عباس و عمر و علی و ابوسفیان کے۔“ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ پیغمبرؐ کے خاندان کے صرف سات افراد رہ گئے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ”یہ سات افراد علیؑ، عباس، فضل بن عباس، ابوسفیان، جعفر ابن ابوسفیان، ربیعہ ابن حارث اور اسامہ بن زید تھے۔ ان کے علاوہ آٹھویں امین ابن عبید تھے۔ اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد پیغمبرؐ نے شہر طائف کا محاصرہ کیا کیونکہ مشرکین نے جنگی چھادنی طائف میں منتقل کر دی تھی اور وہاں محاذ بنا لیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک دن پیغمبرؐ نے علیؑ کو طلب فرمایا اور کچھ دیر تک خصوصی گفتگو کرتے رہے۔ اس واقعہ نے لوگوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں کہنا شروع کیں۔ بعض افراد نے کہا ”پیغمبرؐ کی ان کے ابن عم سے بڑی دیر تک راز دارانہ گفتگو (نجوی) ہوتی رہی۔“ جب پیغمبرؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا ”میں نے علیؑ سے نجوی نہیں کیا بلکہ خدا نے ان سے نجوی کیا ہے“ یہ روایت صحیح ترمذی میں درج ہے اور امام ترمذی اس روایت کو علم درایت کی رو سے ”حسن“ اور ”صحیح“ سمجھتے ہیں۔

4A

۹۔ میں غزوہ تبوک واقع ہوا۔ پیغمبرؐ کے انتقال کو ایک سال باقی تھا اور یہ غزوہ پیغمبرؐ کی زندگی کا آخری غزوہ ہے۔ گرمی کا زمانہ تھا، تیز اور گرم ہوا پھول پتیوں کو جھلسائے دے رہی تھی۔ پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب، شیعہ توحید کے پروانوں کو حکم دیا کہ جنگ پر چلنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ لیکن علیؑ سے فرمایا: ”آپ مدینہ میں میری جگہ موجود ہیں“-----علیؑ نے غمگین لہجہ میں بڑی بے چینی سے فرمایا۔۔۔۔۔”خَلَفْتَنِي فِي الصَّبَإِ وَالنَّسَاءِ“ (آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے درمیان چھوڑے جارہے ہیں؟)

[illegible]

۱۰۔ ہجری پر ایک نظر

۱۰۔ ہجری میں پیغمبرؐ نے علیؑ کو یمن کی طرف تبلیغ کے لئے روانہ فرمایا۔ پیغمبرؐ نے پرچم خود تیار کیا اور علیؑ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ رکھا جس کا ایک سرا سینہ پر اور دوسرا سرا پشت پر لٹک رہا تھا۔

علی کو تبلیغ کے لئے روانہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمدان کے تمام قبائل اور اکثر اہل یمن ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے۔ علی کا تبلیغ انجام دینے کے بعد مدینہ واپس لوٹ آئے۔

غذیر

اس سال کے آخر میں پیغمبرؐ نے وہ حج ادا کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پیغمبرؐ کی زندگی کا آخری حج تھا۔ اس کے بعد آپؐ کی حیات کے چند ماہ اور باقی رہ گئے۔ جب پیغمبرؐ نے حج پر جانے کا ارادہ فرمایا تو علیؑ اس وقت زکوٰۃ خمس وصول کرنے کے لئے یمن گئے ہوئے

تھے لیکن وہاں سے جلد ہی لوٹ آئے اور پیغمبرؐ سے ملحق ہو گئے۔ حج تمام ہوا۔ پیغمبرؐ جب مکہ سے مدینہ کی جانب لوٹے لگے تو اچانک آپؐ نے غدیر خم میں قافلہ کو ٹھہرانے کا حکم دیا۔ غدیر میں ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ یہ اعلان ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ لوگوں کے لئے تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ ہزاروں افراد پیغمبرؐ کی تقریر کو سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ پیغمبرؐ منبر پر تشریف لے گئے اور آپؐ نے ایک لمبا خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے آپؐ نے مسلمانوں کو اس بات کی خبر دی کہ ”میں بہت جلد اس دنیا سے رحلت کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے انجام دئے گئے کاموں کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ پھر مسلمانوں سے اسلام پر ثابت قدم رہنے کا عہد و پیمان لیا آپؐ نے فرمایا:

اے لوگو! خدا مجھے جلد ہی اپنی بارگاہ میں بلانے والا ہے اور میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں بھی ذمہ دار ہوں اور تم بھی ذمہ دار ہو۔ لہذا ہمیں دیکھنا ہے کہ ایسے موقع پر تم کیا کرو گے؟

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ”کیا تم اس بات کا اقرار نہیں کرو گے کہ اس معبود کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ جنت، جہنم، موت، موت کے بعد زندہ کیا جانا حق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیامت آئے گی اور خدا مردوں کو زندہ کرے گا؟“

حاضرین نے جواب دیا: ”بے شک! ہم کو ان تمام باتوں کا اقرار ہے۔“ پیغمبرؐ نے فرمایا: ”اے خدا تو گواہ رہنا۔“

پھر آپؐ نے فرمایا: ”اے لوگو! اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان کے اوپر خود ان کے نفس سے زیادہ حق رکھتا ہوں لہذا جس کا میں مولا ہوں، اس کے یہ علیؑ مولا ہیں (اور علیؑ کی طرف اشارہ فرمایا) پالنے والے! تو اس کو دوست رکھنا جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھنا جو علیؑ سے دشمنی کرے۔“

اس کے بعد حضرت نے فرمایا: ”اے لوگو! میں تم سے پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا جب تم حوض کوثر پر میرے پاس پہنچو گے تو میں تم سے سوال کروں گا کہ میرے بعد تم نے ثقلینؑ

کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ثقلینؑ میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جو ایسا وسیلہ ہے جس کا ایک سرا خدا سے ملا ہوا ہے اور دوسرا سراسر تمہارے ہاتھ میں ہے، اسے مضبوطی سے پکڑے رہو، گمراہ نہ ہونا، حق کو باطل سے نہ بدلنا۔ ثقلینؑ کی دوسری فرد میری عمرت اور اہل بیتؑ ہیں۔ خدا نے مجھ کو خبر دی ہے کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔

علامہ ابن حجر مکی نے ”صواعق محرقہ“ (ص/ ۲۵-۲۶، مطبوعہ مصر) میں اس روایت کو درج فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے تین بار اصحاب سے پوچھا: ”الست اولیٰ کم من انفسکم؟“ (کیا میں تم پر تمہارے نفسوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟) لوگوں نے جواب دیا: ”بے شک! بے شک!!“

اس کے بعد پیغمبرؐ نے علیؑ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور فرمایا: ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ۔۔۔۔۔“

”جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں، خدا! تو اس کو دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے، جو علیؑ کی مدد کرے تو اس کی مدد فرما جو علیؑ کو چھوڑ دے اس کو ذلیل کر، علیؑ جس طرف مڑیں حق کو ادھر موڑ دے۔“

ابن حجر اس روایت کی تحقیق کے ضمن میں لکھتے ہیں: ”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ترمذی، نسائی، احمد ابن حنبل اور محدثین کی ایک کثیر جماعت نے اسے درج کیا ہے۔ اس کے طریق اسناد بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ سولہ صحابیوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور احمد ابن حنبل ایک جگہ کہتے ہیں کہ تیس اصحاب نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ انھوں نے اس حدیث کو اپنے کانوں سے سنا ہے اس کے اکثر اسناد صحیح اور حسن ہیں۔ (صواعق محرقہ، ص/ ۲۵، مطبوعہ مصر)

”استیعاب“ (ابن عبد البر) ”اسد الغابہ“ (ابن اثیر جزری) اور مختلف کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔

امام الحدیث حافظ ابن عقدہ نے ”موالات“ میں سوا صحابیوں سے، امام جزری شافعی نے

تیس اصحاب سے، امام احمد ابن حنبل نے بھی تیس اصحاب سے اور طبری نے ۷۵ اصحاب سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

محمد بن اسماعیل صنعانی نے ”روضہ ندبہ“ میں، سیوطی نے ”جمع الجوامع“ میں، ذہبی نے ”تذکرۃ الحفاظ“ میں اور جزری نے ”سنی المطالب“ میں اس حدیث کو متواتر اور صحیح سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ ابن اسحاق، ابن سعد، مسلم، دارمی، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو ضبط تحریر کیا ہے۔ اس لئے کوئی بھی اس حدیث کی اصالت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس واقعہ کے وقوع میں تمام فرقے اور مذاہب ایک نظر ہیں۔ اس طرح علیؑ کی زندگی کا پہلا دور جو اللہ ہ میں پیغمبرؐ کی رحلت کے ساتھ تمام ہو گیا وہ سراسر اسلام کی راہ میں جہاد، ایثار اور نصرت کا دور ہے۔ شیعہ سنی تمام اہم تاریخ وحدیث کی کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ حضرت علیؑ پیغمبرؐ کے سب سے قریبی اور نمایاں صحابی اور ہر جنگ کے سورما تھے۔ آپ نے اسلام میں سب پر سبقت کی۔ دعوت ذوالعشیرہ میں حمایت رسولؐ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہجرت کے موقع پر آپ نے جان کو ہتھیلی پر رکھا۔ ہجرت کے بعد پیغمبرؐ نے آپ کو اپنے روحانی بھائی ہونے کا اعلان فرمایا۔ جنگ بدر واحد وخیر و خندق میں مسلمانوں کی آبرو بچائی اور دین کا دفاع کیا اور آخر میں غدی خم میں پیغمبرؐ نے آپ کو اپنے جانشین اور وصی کے طور پر پہنچوایا۔

اس تیسویں (۲۳) برس کی مدت میں علیؑ ایسی شخصیت ہیں جو تمام واقعات میں موجود اور تمام معرکوں میں درخشاں رہی۔ اس دور میں علیؑ کی نمایاں خصوصیتیں فداکاری، ایثار و شجاعت، صداقت اور پیغمبرؐ پر ایمان ہے یعنی علیؑ دین اسلام کی پائیداری کے لئے مسلسل ۲۳ سال تک ایثار، فداکاری اور جہاد کا مظاہرہ کرتے رہے۔

دور دوم: پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ کی زندگی

جناب امیر المومنینؑ کی زندگی کا دوسرا دور رحلت پیغمبرؐ سے قبول خلافت یعنی ۱۱ھ سے

۳۵ھ تک ہے، یہ ان کی خاموشی کا دور ہے۔ یہ وہ ۲۵ سال کا طویل وقفہ ہے جب حضرت علیؑ مسلمانوں کے اتحاد اور اسلام کے وجود کی حفاظت کے لئے مہربلب اور سیاست سے کنارہ کش رہے۔

اس میں شک نہیں کہ امیر المومنینؑ اپنی لیاقت اور پیغمبرؐ کے ارشاد گرامی کی بنا پر خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے اور پیغمبرؐ کے بعد جن سیاسی اصولوں کو اپنایا گیا تھا ان میں سے اکثر کے شدید مخالف تھے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ تھا اسلامی مساوات اور عدالت سے انحراف اور مقدار پر معیار کو قربان کر دینا۔ علیؑ کی نگاہوں میں اسلامی دنیا کی جغرافیائی اور سیاسی حدود کی توسیع ثانوی حیثیت رکھتی تھی، اور جو زیادہ اہم تھا وہ عقیدتی گہرائیوں کی توسیع اور دین کا تحفظ تھا۔

اس کے باوجود کہ امیر المومنینؑ نے مسلمانوں کی رہبری اور خلافت کو اپنا حق اور دوسروں کو اس اہلیت سے محروم سمجھا ہے۔ سیاسی رہبری کے ذریعہ حکومت اسلامی کا قیام اور اسلام کا استحکام علیؑ کا حق تھا، پھر بھی انہوں نے اپنی عمر کے ۲۵ سال مسلمانوں کے اتحاد کے لئے قربان کر دیئے۔ (بقول خود) ”آنکھ میں کانٹا اور گلے میں ہڈی“ ہونے کے باوجود خاموش رہے۔

رحلت پیغمبرؐ سے خلافت علیؑ تک کا ۲۵ سالہ دور خاموشی کا دور ہے، مگر یہ خاموشی اور سکوت ان معنوں میں ہے کہ انہوں نے اپنی وہ شمشیر جو ہر معرکہ میں بجلی کی طرح کوندا کرتی تھی اور جو اسلام کی فتح کا باعث ہوتی تھی اسے پھر بے نیام نہیں کیا اور کوئی مسلح جنگ نہیں کی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انہوں نے اعتراض نہیں کیا یا غلط سیاسی مصالحوں کی مخالفت نہیں کی یا سیاسی اور اجتماعی زندگی سے مطلقاً کنارہ کش ہو گئے۔ وہ رہنمائی کے فرائض کو برابر انجام دیتے رہے اور جب بھی انہوں نے دیکھا کہ آبروئے اسلام خطرے میں ہے تو سیاسی مشوروں سے بھی دریغ نہیں کیا۔

حضرت علیؑ خاموش کیوں رہے؟ اپنے حق کے لئے جنگ کیوں نہ کی؟ حقیقتاً امیر المومنینؑ جنگ وجدال اور شکست و مرگ سے ڈرنے والے نہ تھے، اگر جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو کیا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ شہید ہو جاتے۔ علیؑ تو وہ ہیں جن کا اپنا قول تھا: وَاللّٰہُ لَا بِنِیْ

طَالِبِ أَنَسٍ بِأَمُوتٍ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ أُمِّهِ“ یعنی ”خدا کی قسم! پسر ابوطالب موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا ایک بچہ اپنی ماں کے سینے سے۔“

امیر المومنینؑ کے سکوت کا سبب؟

امیر المومنینؑ کی خاموشی کا یہ اقدام نہایت ہی جنجالتا اور منطقی تھا، مندرجہ ذیل اسباب پر غور کرنے کے بعد ہم صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

اسلام کا پودا نورس تھا اور ابھی تک بادِ سموم سے محفوظ نہیں تھا، ابھی اسلام زمانہ طفلی میں تھا اور اس کو سخت توجہ، نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی، اور علیؑ سے بڑھ کر اسلام کا درد کس کے دل میں ہو سکتا تھا؟ حضرت علیؑ اس ماں کی طرح تھے جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا تھا مگر وہ خاموش رہنے اور کوئی اقدام نہ کرنے پر مجبور ہے۔ اگر تلوار نکالتے ہیں تو ممکن ہے بچہ زخمی ہو جائے یا مرجائے۔ اگر ان ابتدائی مراحل میں ہی اسلامی معاشرہ خانہ جنگیوں کا شکار ہو جاتا تو وجودِ اسلام کے خطرے میں پڑ جانے کا قوی امکان تھا اور جاہلیت کی طاقتیں جو ابھی بھی مضبوط تھیں انقلاب کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتی تھیں۔ رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد ارتداد کا مسئلہ جو ”ردہ“ کہلاتی ہے، گوشہ و کنار میں شروع ہو چکا تھا۔ اگر اسلام میں خانہ جنگی شروع ہوتی تو اسلام ختم ہو جاتا ہے۔

اس زمانے کی نزاکت کے پیش نظر امیر المومنینؑ کے لئے اتحادِ اسلامی اور مسلمانوں کی یکجہتی دوسری تمام باتوں سے زیادہ اہم تھی۔ ایران و روم کی بڑی طاقتیں، حجاز میں ظاہر ہونے والی نئی طاقت سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں۔ ابوسفیان جیسے قریشی منافق اور عبد اللہ بن ابی جیسے مدینے کے منافق، کسی بہانے کی تلاش میں تھے تاکہ امتِ اسلامی کے اتحاد کو ختم کر دیں۔ ان حالات میں حضرت علیؑ نے وجودِ اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لئے، سب سے بڑی ایثار و قربانی کا مظاہرہ فرمایا۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ خود فرماتے ہیں: ”وَإِنَّمِ الْبَدَلُ وَلَا مَحَافَةَ الْفُرْقَةِ بَيْنَ

الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ يَغُودَ الْكُفْرُ وَيَبُورَ الَّذِينَ لَكُنَّا عَلَى غَيْرِ مَا كُنَّا لَهُمْ عَلَيْهِ“ (خدا کی قسم مسلمانوں کے درمیان تفرقہ، کفر کے واپس آنے اور دین کے مٹ جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو میرا طرزِ عمل قطعی مختلف ہوتا) ابن ابی الحدید نے خطبہ ۱۱۹ کی شرح میں کبھی سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا فرمایا: ”رسول خدا کے بعد قریش نے میرا حق غصب کر لیا لیکن میں نے صبر کیا۔“ ”فَرَأَيْتَ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى ذَلِكَ أَفْضَلُ مِنْ تَفْرِيقِ الْكَلِمَةِ الْمُسْلِمِينَ وَتَفْكِ دِمَائِهِمْ وَالنَّاسِ حَدِيثُوا عَهْدٍ بِإِسْلَامٍ وَالَّذِينَ تَمَخَّصَ مَخْصَصَ الْوُطْبِ يُفْسِدُهُ أَذْنَى وَهْنٍ وَيَعْكِسُهُ أَقْلُ خَلْقٍ“ (میں نے دیکھا کہ حق کے ضائع ہونے پر صبر کرنا، مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے اور ان کا خون بہانے سے بہتر ہے، کیونکہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اور دین تازہ برآمد کئے ہوئے مشک کی مانند ہے، ذرا سی غلطی کو تباہی اسے تباہ کرنے کے لئے کافی ہوگی اور ادنیٰ ترین شخص اس کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔)^(۱)

صرف ان دو اسباب یعنی اسلام کا تحفظ، اور امتِ اسلامی کی یکجہتی کا مشاہدہ ہمیں یہ سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ وقت کے اس نازک دور میں امیر المومنینؑ کے سکوت کا سبب کیا تھا اور آپ نے وحدتِ اسلامی کی حفاظت کے لئے کیا کیا ایثار اور قربانیاں پیش کیں، خود مولاً فرماتے ہیں: ”وَاعْظَيْتُ عَلَى الْقَدَى وَشَرِبْتُ عَلَى الشَّجَى وَصَبَرْتُ عَلَى اخِذِ الْكُظْمِ وَعَلَى أَفْرِ مِنَ الْعُلْقَمِ“ (میری آنکھ میں گنا تھا لیکن میں نے اپنی آنکھ کو بند کیا۔ میرے حلق میں بڑی پھنس گئی تھی اور مجھے اسے حلق سے اتارنا پڑا، میرا گلا گھٹا جا رہا تھا اور حنظل سے کڑوا میرے حلق میں پڑا تھا پھر بھی میں نے صبر کیا۔)

علیؑ کے مخالفین بظاہر کامیاب کیوں؟

علیؑ کی عظمت، فضیلت اور امتیازِ اظہر من الشمس تھی اور تمام لوگ ان کے مرتبے اور ان کی

(۱) ملاحظہ ہو: سیری در نہج البلاغہ، استاد شہید مطہری، ص ۱۸۲-۱۸۱

فضیلت سے اچھی طرح واقف تھے پھر بھی کیوں سیاست، حقیقت پر غالب آگئی اور اسلامی معاشرے کی سیاسی رہبری سے وہ کیوں محروم رہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علیؑ سیاست بازی سے اجتناب کرتے تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ ابھی زمانہ طفلی میں تھا اور ایام جاہلیت کی قدریں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ نیز شیخو حیت، قبیلوں سے وابستگی اور جاہلانہ باتوں کا لحاظ باقی تھا۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ تینس برس تک حضرت علیؑ اسلام کی حمایت اور پیغمبرؐ کی نصرت میں قریش کے سربراہ اور تمام قبائل سے نبرد آزما رہے تھے۔ اس کی وجہ سے مشرکین مکہ میں کم ہی خاندان ایسے تھے جو شمشیر علیؑ کو فراموش کر سکے ہوں۔ قبائلی نظام میں جہاں انتقام معاشرے کے لئے جن کا مستحکم ترین سماجی اصول تھا ان کے لئے وہاں اس مسئلہ کا فراموش کر دینا بہت ہی مشکل تھا۔

ہمیں ایک اور نکتہ پر بھی نظر رکھنا چاہئے جس کی نشاندہی استاد مطہری نے اپنی معروف کتاب ”جاذبہ ودافعہ علی علیہ السلام“ میں کی ہے۔ عظیم تاریخی شخصیتوں کے خصائص میں ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان میں جاذبہ اور دافعہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود رہی ہیں۔ بے خاصیت شخصیتوں میں نہ قوت جاذبہ ہوتی ہے نہ قوت دافعہ ان کے نہ جانی دشمن ہوتے ہیں، نہ جاں نثار دوست۔ مگر علیؑ میں جاذبہ ودافعہ دونوں ہی قوتیں غیر معمولی تھیں، جن کی شخصیت ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ایک مقصد رکھتے ہیں ایک اصول رکھتے ہیں ایسے لوگوں میں قوت جاذبہ بھی ہوتی ہے اور قوت دافعہ بھی۔ شہید مطہریؒ لکھتے ہیں: ”شاید کسی بھی زمانے میں کوئی دوسرا علیؑ سے بڑھ کر قوی قوت جاذبہ اور قوت دافعہ کا مالک نہ ملے گا، دوست ایسے جوان کے نام پر جان دے دیں اور دشمن ایسے کہ ان کے نام سے اندر ہی اندر سخت پیچ و تاپ کھاتے رہتے ہیں۔ علیؑ نے اپنے دشمن پیدا کئے اور یہ ان کی عظمت و بزرگی کا ایک اور ثبوت ہے۔ ہر مشن اور مقصد رکھنے والا ہر شخص خصوصاً انقلابی انسان اپنے اصولوں کی ترویج کی راہ میں بہت سے بدترین قسم کے دشمن اور مخالف پیدا بھی کر لیتا ہے۔“^(۱)

(۱) ملاحظہ ہو: کتاب جاذبہ ودافعہ علی علیہ السلام، ص ۱۰۸

علیؑ کا فیصلہ کن انداز اور اصولی و مسلکی (مشنری) برتاؤ اس بات سے مانع تھا کہ وہ ہر ایک سے سمجھوتا کریں۔

علیؑ کو نظر انداز کرنے کی چوتھی وجہ ’حسد و رقابت‘ تھی۔ علیؑ کی شخصیت تینس برس تک پیغمبرؐ کی نظر میں سب سے قریبی معتمد شخصیت تھی اور تمام حوادث و آشوب میں انھوں نے نمایاں اور ممتاز کردار ادا کیا ہے۔ اس مسئلے نے اپنے کو ”بزرگان قوم“ سمجھنے والے بہت سے لوگوں میں احساس کمتری کے جذبے کو ابھارا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو علیؑ سے بغض و حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر معرکہ میں یہی بیس بائیس سال کا جوان تھا جس نے ہر جنگ کے نتیجے کو اسلام کے حق میں بدل دیا۔ ہر واقعہ میں پیغمبرؐ نے خاص کلیدی کردار (Key-role) کو ان کے حوالہ کیا۔ علیؑ ہیں جن کو پیغمبرؐ نے اپنا معنوی برادر بنایا۔ وہی ہیں جو دامادی اور حضرت فاطمہؑ سے شادی کے لئے منتخب ہوئے۔ اس طرح کے مسائل نے اسلامی معاشرہ کے بہت سے بارسوخ افراد کے دلوں میں گرہ ڈال دی۔ اسی وجہ سے جارج جرداق (George Jordec) کہتا ہے کہ: ”علیؑ کی تمام تکالیف اور اذیتیں ان کی عظمتوں کا خمیازہ تھیں۔“

تیسرا دور: دور خلافت

۳۵ھ کے اواخر میں خلیفہ سوم کی وفات ہوئی اور عوام کے اصرار اور ان کے اجماع سے علیؑ ظاہری خلیفہ ہوئے۔ اسی تاریخ سے امیر المومنینؑ کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی مدت ان کی شہادت تک چار سال نو ماہ اور چند روز ہے۔

تیسرا دور علیؑ کی خلافت کا زمانہ ہے۔ روح اسلام کو عمل میں ظاہر کرنے کا دور ہے۔ علیؑ چاہتے ہیں کہ نظام اسلام خصوصاً عدالت اور مساوات اسلامی کو رائج کریں۔ یہ دور وہ ہے جب علیؑ ایک عظیم سلطنت (سامراج) قلمرو کے مطلق سربراہ ہیں جس کی وسعت فلسطین، لبنان، عربستان، یمن، عراق، ایران، شام، مصر اور دیگر مقامات تک ہے لیکن اس کے باوجود جو کی روٹی کھاتے ہیں

اور خاک پر بیٹھ کر فقیروں کے دست خوان میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام اور قیصر و کسریٰ کے نظام میں موجود فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالیں جس میں ظالم و مظلوم کا کوئی وجود نہ ہو، ہر شخص صرف خدا کا بندہ ہو، آزاد ہو اور عدالت اور خدا کے حضور میں سب ایک صف میں کھڑے ہوں۔

علیؑ اس آزمائشی دور میں اسلام کے سیاسی، عدالتی اور اقتصادی نظام کو اسی معیار پر لانا چاہ رہے تھے جس معیار پر پیغمبر اسلام نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، مگر چونکہ پیغمبر اسلام کے بعد سنگ بنیاد ہی غلط رکھ دیا گیا تھا اس وجہ سے علیؑ کو بے شمار مشکلات اور بے اندازہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا، مسلمان خوشحال زندگی کے عادی ہو چکے تھے، ان میں تفریق و استحصال کی عادت پڑ چکی تھی، ایام جاہلیت کی قدریں پلٹ آئی تھیں، جاہلانہ تعصب سرا بھار رہا تھا، ان تمام مشکلات کے باوجود علیؑ مساوات و عدالت اسلامی کی ترویج کے لئے کوشش کرتے رہے۔ مملکت اسلامی کے سربراہ اور سیاسی رہبر منتخب ہونے کے بعد علیؑ منبر پر تشریف لے گئے اور اعلان کیا: ”میں خلافت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سنا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میرے بعد جو شخص بھی امور (حکومت) کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اگر وہ عدالت کرتا ہے تو اس کی نجات ہوگی، ورنہ وہ قعر جہنم میں گرے گا۔“ اس کے بعد اپنی حکومت کا اعلان اس طرح کیا: ”وہ جماعت یا گروہ جس کو دنیا نے اپنے اندر غرق کر لیا ہے جس نے املاک، نہریں، عمدہ گھوڑے اور نازک اندام کنیزوں کو اپنے لئے مہیا کر لیا ہے، کل میں یہ تمام چیزیں ان سے واپس لے کر بیت المال میں داخل کر دوں گا اور انہیں اس میں سے صرف اتنا ہی دوں گا جتنے کے وہ حقدار ہیں۔ میں فوری طور پر اپنے واضح منصوبہ کا اعلان کرتا ہوں۔“^(۱)

پیغمبر اسلامؐ کے بعد معاشرے میں ایام جاہلیت کے بہت سے آثار دوبارہ نمایاں ہونے لگے تھے۔ ”حقیقت“ کو ”مصلحت“ پر قربان کر دیا گیا تھا، جہالت کی قوت لوگوں پر حاوی

تھی، معاشرے میں نا انصافیوں، ظلم اور تفریق کا بھی زور بڑھنے لگا تھا۔ جو لوگ خود کو پیغمبر اسلام کے مقرب اور ”مجاہد اول“ شمار کرتے تھے اپنے لئے خصوصی امتیازات و تعیش کے قائل تھے، وہ جدید حاکم طبقہ کی صورت میں برسرِ اقتدار آگئے تھے اور قبائلی تفریق اور نسلی نظام کو انہوں نے دوبار ہراج کر دیا تھا۔ عنانِ خلافت سنبھالنے کے بعد علیؑ نے معاشرے سے اس غلط روش کو مٹانے اور اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کی کوشش کی۔ جن لوگوں کا مفاد خطرے میں پڑ گیا تھا، وہ مختلف بہانوں سے علیؑ کے مقابلہ میں آئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ کے پورے عہدِ خلافت کے پانچ سال جنگ و کشاکش کی نذر ہو گئے۔ انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا گیا۔ مگر امیر المومنینؑ نے ہر مشکل کو ہر پریشانی کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا مگر ”حقیقت“ کو کبھی ”مصلحت“ پر قربان نہیں کیا یہاں تک کہ اسی راہ میں شہید ہو گئے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے: قُتِلَ فِي مَحْزَرٍ اَبِهٖ لِيَشِدَّ عَذْلُهٗ۔ (وہ عدل و انصاف میں اپنی سختی کی وجہ سے محراب میں قتل کئے گئے)۔

علیؑ اور معاشرے کی تبدیلی:

علیؑ معاشرے کی تبدیلی میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر علیؑ پیغمبر اسلام کے بعد براہِ راست بلا فاصلہ خلافت سنبھالتے تو یقیناً پوری شد و مد کے ساتھ حقیقی نظام اسلام کو رائج کر دیتے، لیکن ۲۵ سال کے وقفہ میں بالخصوص خلافت سوم اور مروان و معاویہ کے لوٹ مار والے دورِ اقتدار میں اسلامی معاشرہ جنگ، عدل، جہاد اور شہادت کی راہ سے ہٹ چکا تھا اور تن آسانی، دولت کی جمع خوری اور تعصب کا شکار ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں لوگوں کا خصوصاً مذکورہ بالا طبقہ کا علیؑ کے حسبِ منشاء اسلامی قید و بند اور نظامِ عدل و مساوات کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ علیؑ سے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ احکام اسلام اور نظام عدالت کے معاملہ میں کوئی تساہلی برتیں یا ”حقیقت“ کو ”مصلحت“ پر قربان کرتے ہوئے کسی سمجھوتے کے متعلق سوچیں۔ عام لوگ جو ”بزرگانِ قوم“ کے تابع اور جہل کا شکار تھے تن آسانی کے عادی ہو چکے تھے وہ علیؑ کے اقدامات کے حق میں

نہ تھے اور ان کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ غرض کہ علیؑ کی شخصیت ہیں اور ایسے معاشرے میں پڑ گئے جہاں ان کی توقعات کو سمجھنے والا اور ان کے نفاذ کا تحمل کرنے والا کوئی نہیں ہے

علیؑ کو کن لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا؟

علیؑ کو عدالت و مساوات قائم کرنے اور احکام اسلام کے اجرا کی کوشش میں تین گروہوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جن کے نام ان کی اصطلاح میں ”قاسطین“، ”مارقین“ اور ”ناکشین“ تھے۔

(۱) قاسطین

قسط اور قاسط سے ماخوذ ہے۔

قاسط وہ ہے جو قسط کے خلاف، عدل کی ضد، شنگر، غاصب، خود سر ہیں جن پر روح نفاق اور جن پر سیاست حاوی ہے اور زیادہ سے زیادہ اقتدار کے طالب ہیں۔ چونکہ علیؑ کا مقصد ظلم و جور کے خلاف جنگ تھا اس لئے اس گروہ سے جنگ ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ علیؑ اور ”قاسطین“ کے درمیان جنگ کا نمونہ ”صفین“ ہے۔

(۲) ناکشین

ناکشین یعنی عہد شکن، انسان کو ادھڑ میں چھوڑ دینے والے اور اپنے مفاد کی خاطر اور خود غرضی میں دوسروں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے، یہ سرمایہ پرست تھے۔ علیؑ کے نظام عدل و مساوات نے ان کے حرص و طمع کے پندار کو مجروح کیا۔ ”جنگ جمل“ ناکشین سے نبرد آزما مائی کا نمونہ ہے۔

(۳) مارقین

مارقین وہ تھے جو بظاہر زہاد و خشک زاہد، بیراگی لیکن باطن بے حد متعصب تھے۔ کج فہمی، تعصب، بے شعوری، جہالت اور افراط کی بنا پر یہ علیؑ سے ٹکرائے۔ خوارج ”نہروان“ اسی گروہ

کی مثال ہیں۔^(۱)

علیؑ کا مقصد معاشرے میں اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی نظام کو مکمل طور پر رائج کرنا اور جہاں اسلام کو ایام جاہلیت کے ان عناصر کے دوبارہ اقتدار سے بچانا تھا جنہوں نے بعد میں بنی امیہ کی صورت میں مسلمانوں کی سیاسی رہبری کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، مگر مذکورہ بالا تینوں گروہوں سے کشمکش علیؑ کی مقصد برآری میں حارج رہی، مگر یہ علیؑ ہی کی ذات تھی جس نے اپنی خاموش تقریر اور انداز نشست و برخاست کے ذریعہ اسلام کی حقیقی روش کو بچا کر بطور امانت تاریخ (آئندہ نسلوں) کے سپرد کر دیا۔

(۱) ملاحظہ ہو: قاسطین، ناکشین، مارقین، ڈاکٹر شریعتی اور ”جاذبہ ودافعہ علی علیہ السلام، استاد مطہری، ص ۱۱۱ و ۱۱۳

امام حسن علیہ السلام:

شاہی اسلام سے امامت والے اسلام کے مقابلہ کے مظہر

اللہ تعالیٰ نے ائمہ گومت کے لئے نمونہ بنایا ہے۔ اسی وجہ سے ہر امام کو مختلف سیاسی اور سماجی ماحول ملتا کہ معاشرے میں موجود مختلف مسائل سے متعلق ان کا رد عمل سامنے آئے اور اس طرح مسلمانوں کے عملی راہنما بن سکیں۔ انہوں نے مخالفوں سے مقابلے کے مختلف انداز اور طریقے اپنائے اور یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ زمانے کے حالات کے مطابق لائحہ عمل اختیار کریں، مگر ان سب کا متفقہ مقصد دین کی حفاظت اور اسلام کی برتری ہو۔ اماموں کے مقابلے کی صورتیں اور ڈھنگ تو مختلف تھے مگر مقصد مشترک تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ کسی نے مسلح جنگ کے ذریعہ مقصد میں کامیابی حاصل کی، کسی نے صلح کے ذریعہ۔ ان تمام پیشواؤں میں امام حسنؑ کے حالات اور ان کی جنگ کا انداز ایک مخصوص خصوصیت کا حامل ہے۔

امام حسنؑ: سامراج کے مقابلہ میں امامت کے علمبردار

حضرت معاویہ اسلام کے سیاسی نظام کو امامت سے بدل کر ”ملوکیت“ (شاہی/سامراج) کی شکل میں لانے کے بانی اور نمونہ ہیں۔ جو مقابلہ امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان ہوا، وہ دراصل امامت اور سامراج کا مقابلہ تھا۔

’امامت‘ کا حتمی مقصد اسلام کو رواج دینا تھا جبکہ اسی کے برعکس ’ملوکیت‘ کا مقصد اسلام کے نام پر حصول اقتدار کی خاطر ہر حربہ کا استعمال کرنا تھا، جبکہ ’امامت‘ سختی کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پابند رہی۔

ملوکیت صرف اسی حد تک اسلام کی نام لیوا تھی اور اسے مانتی تھی جس حد تک اسلام کو ماننا اور اس کا نام لینا عوام کو فریب کے جال میں پھنسانے میں کارآمد ہو جبکہ ’امامت‘ اسی حد تک اقتدار

کی خواستگار تھی جتنا تحفظ اسلام کے لئے مفید ہو، یہاں تک کہ ’امامت‘ تحفظ اسلام کی خاطر اقتدار سے دست بردار ہونے تک کو تیار تھی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جو اقتدار اسلام کی خدمت کے کام نہ آئے اس اقتدار کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

’امامت‘ کا محور حقیقت تھا اور اس کا معیار قرآن اور سنت تھا جبکہ ملوکیت بنام اسلام کا محور ذاتی مفاد اور اس کا معیار ایران و روم کا دربار (سامراج) تھا۔ چنانچہ ’ملوکیت‘ ’مصلحت جو رہی اور ’امامت‘ ’حقیقت جو‘۔ اسی وجہ سے ’امامت‘ میں اقتدار موروثی نہیں ہوتا جب کہ ’ملوکیت‘ میں حکومت موروثی ہوتی ہے۔ ’امامت‘ والے اسلام میں سیاسی مراکز مسجدیں ہوتی ہیں جبکہ ’ملوکیت‘ والے اسلام میں عظیم الشان محل سیاسی مراکز ہوتے ہیں۔ امامت والے اسلام میں بیت المال کو خدا اور امت کی امانت تصور کیا جاتا ہے اور حکومتی اسلام میں خلیفہ کا ذاتی مال سمجھا جاتا ہے۔ امامت والے اسلام میں تمام سماجی کام عوام کے مشورہ سے ہوتا ہے اور عوام کو اس کا حق ہوتا ہے کہ جائز کی موافقت اور ناجائز کی مخالفت کریں جبکہ اس کے برعکس ملوکیت میں عوام کی زبانوں پر قفل لگا دئے جاتے ہیں، حجر بن عدی جیسے لوگ شہید کر دئے جاتے ہیں، قتل و غارتگری، خوف و دہشت، ظلم و جبر اور پابندی کا نظام رائج ہوتا ہے۔ امامت میں قاضی (نج) احکام خداوندی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور ملوکیت میں خلیفہ کی ضرورت اور مرضی کے مطابق احکامات نافذ ہوتے ہیں۔

امام حسنؑ اور معاویہ کا مقابلہ اقتدار کے دو دعویداروں کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ ’امامت‘ اور ’ملوکیت‘ کا مقابلہ ہے، دو طرز فکر اور دو راہ عمل کا مقابلہ ہے۔ امام حسنؑ جن لوگوں کے مقابلے پر تھے، وہ حقیقتاً مسلمان نہیں تھے بلکہ اسلام کی نقاب میں اسلام دشمن عناصر تھے۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑے تھے۔ یہ وہ انقلاب مخالف عناصر تھے جن کو مشرکین مکہ کے سردار ابوسفیان نے جنم دیا تھا، جن کے دل میں انقلاب اسلام کے خلاف کینے کا جو الاکھی پھوٹ رہا تھا۔ یہ لوگ اندر ہی اندر دھیرے دھیرے انقلاب (اسلام) کے خلاف کھجڑی پکا رہے تھے۔ اس موقع پر جبکہ معیار (Quality) کو مقدار (Quantity) پر قربان کیا جا رہا تھا، امام حسنؑ ان انقلاب مخالفوں سے نبرد

آزمائے جو ”ملوکیت بنام اسلام“ کی صورت میں نمودار ہوئے تھے۔

امام حسنؑ نے صلح کیوں کی؟

امام حسنؑ نے صلح کیوں کی؟ اور اقتدار کو ملوکیت کے علمدار اور جاہلی بغاوت کے سربراہوں کے حوالے کیوں کر دیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے لازم ہے کہ مندرجہ ذیل تین نکات پر نظر رکھیں:-

(۱) پہلی بات یہ کہ چونکہ سلطنت روم و شام و ایران کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں غلط سیاست ’مقدار‘ کی طرف انحراف اور ’معیار‘ کی طرف سے عدم توجہی کی وجہ سے مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان کے خیالات اور طرز فکر میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ لہذا جب انہیں ملوکیت میں اپنی سابقہ تہذیب، اخلاق اور طرز فکر کی جھلکیاں نظر آئیں تو امام حسنؑ کی سربراہی کے مقابلے میں جاہلیت کے تدریجی انقلاب کے سربراہوں کے تابع (Follower) ہو گئے۔ انہیں اسی میں بہتری اور بھلائی نظر آئی۔

نئے مسلمانوں کے قلب و ضمیر اور رگ و پے میں صحیح روح اسلام کے سرایت نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی سابقہ تہذیب، عادات اور طرز فکر سے مماثلت کی بنا پر سلطنت روم و ایران کے عادات، تہذیب اور طرز فکر سے بآسانی مانوس ہو گئے اور اسی کو اپنا لیا۔ اس طرح معاویہ کی حکومت کے استقرار اور موروثی سلطنت کی بنیاد کے استحکام کے لئے زمین ہموار ہوتی گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ کا دار السلطنت شام ہے جہاں کے عوام قیصر و کسریٰ کے نظام کے عادی ہو چکے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی نظام، جیسا کہ حضرت علیؑ چاہتے تھے، رائج نہ ہو سکا۔ ”معیار“، ”مقدار“ پر قربان ہو چکا تھا۔ حضرت علیؑ اس نظریہ کے حامی تھے کہ اسلامی سلطنت کی حدود اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ سے زیادہ ضروری مسلمانوں کی موجودہ تعداد میں عقائد،

اخلاق اور کردار کو پائیدار کیا جانا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد کے ابتدائی برسوں میں قوت ایمان کی بنا پر اسلام کی سیاسی سرحدوں میں بے مثال توسیع ہوئی اور مختلف تہذیب، عقائد اور ملت کے افراد حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، مگر ان کے اس دینی اور فکری انقلاب کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی جس کی حضرت علیؑ سخت تاکید فرماتے تھے۔ دوسروں سے امیر المؤمنینؑ کے نظریاتی اختلافات کے اسباب میں یہ بات بھی شامل تھی۔ ہم اسے ”معیار“ کو ”مقدار“ پر قربان کرنا کہتے ہیں۔ تاریخی رو میں مسلمانوں کی بے انتہا بد نصیبی کی وجہ یہی ہے۔

(۲) دوسری بات: جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ”ملوکیت“ والے اسلام میں جس کا حتمی مقصد اقتدار ہے اور اسلام اس مقصد کے حصول کے ایک ذریعہ کے علاوہ کچھ نہیں، وہیں ”امامت“ کے اسلام میں اعلیٰ مقصد اسلام ہے جب کہ اقتدار محض استقرار اسلام کا ایک ذریعہ ہے، جس کے وسیلہ سے اگر اسلامی خدمات انجام نہ دی جاسکیں تو اقتدار کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ امام حسنؑ بھی اگر حضرت معاویہ ہی کی طرح اقتدار بچانے کی خاطر ہر کام انجام دیتے، تو بلاشبہ اپنے لئے ”خليفة المسلمین“ کا خطاب اختیار کر سکتے تھے۔ مگر جیسے ہی انہیں محسوس ہوا کہ اقتدار کے تحفظ کے بجائے اقتدار چھوڑ کر ہی اسلام سے وفا کی جاسکتی ہے، ویسے ہی اقتدار سے دست بردار ہو گئے، کیونکہ ان کا مقصد اسلام تھا، اقتدار نہیں تھا۔

(۳) تیسری بات: چونکہ امام حسنؑ ایک ایسے دشمن کے مقابلہ پر تھے جو اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا، اس لئے صورت حال انتہائی پیچیدہ، مبہم اور غیر واضح تھی، ساتھ ہی جاہلیت کی ایسی تدریجی بغاوت سے سامنا تھا جس کے چہرہ پر اسلام کی نقاب تھی۔ ان حالات میں اس سے مسلح جنگ سے کسی فائدہ کی توقع نہ تھی، لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ نیا انداز بروئے کار لایا جائے کیونکہ وہ چاہتے تھے، ”جاہلیت قریش“ کے مکروہ چہرہ پر جو نقلی اسلام کی حسین و دلفریب نقاب پڑی ہوئی ہے، اسے تار تار کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ امام حسنؑ محسوس کر رہے تھے کہ ایک چیز ایسی تھی جو معاویہ سے بھی بڑھ کر خطرناک تھی اور وہ تھی ”تہذیب معاویہ“ یا ”ملوکیت“، چنانچہ ایسے اقدام کی ضرورت

تھی جس سے اس 'آمیزش' کا خاتمہ ہو جائے اور اسلام اور اصول اسلام ملوکیت اور سیرت سلاطین سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔

اس دور کے حالات اور 'معیار' (یعنی جو ہر اسلام) کے مقدار (یعنی مسلمانوں کی تعداد) پر قربان ہو جانے کے سبب سے 'تہذیب معاویہ' کی وسعت کے لئے زمین بالکل ہموار تھی۔ ایسے میں ایسی کارروائی کی ضرورت تھی جس سے معاویہ کی (ظاہری) فتح 'تہذیب معاویہ' کے خاتمہ کی صورت میں ابدی اور دائمی شکست کی آغوش میں موت کی نیند سو جائے۔

امام حسنؑ نے محسوس کیا کہ معاویہ کو فوجی پیمانے پر شکست دینا کافی نہیں ہے اور نہ ہی یہ سیاسی حالات کے اعتبار سے آسان ہے۔ لہذا جو طریقہ طویل مدت میں دائمی طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے، وہ معاویہ کی اصلیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ لہذا امام حسنؑ اس نتیجہ پر پہنچے کہ معاویہ کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ اصلی شکل ظاہر ہو جائے، معاویہ یزید کی شکل اختیار کرے اور 'نقاب پوش نفاق' بے نقاب کفر کی صورت اختیار کر لے، وہ نقلی لبادہ تارتار ہو جائے تاکہ امت اور تاریخ کے لئے فیصلہ آسان اور حق و باطل کا صریحی امتیاز ہو جائے۔

امام حسنؑ نے بظاہر معاویہ کو فتح مند ہو جانے دیا تاکہ تہذیب معاویہ کا طلسم خود بخود ٹوٹ جائے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب یا ڈاکٹر عمل جراحی (سرجری) سے پہلے امراض کے غدود کو کافی حد تک بڑھ جانے کی مہلت دیتا ہے اور پھر اس کے بعد ایک ہی عمل جراحی کے ذریعہ مرض کی بیج کنی کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح امام حسنؑ نے اپنی صلح کے ذریعہ ملوکیت کے سرطانی غدود (Cancerous Glands) کو اپنی انتہا تک پہنچ جانے کی مہلت دے دی تاکہ وارث حسنؑ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اپنے ایک ہی عمل جراحی (Surgery) سے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

مندرجہ بالا تین اہم نکات کا غائرانہ جائزہ امام حسنؑ کی صلح کے اسباب کو سمجھنے میں ہمارے لئے کافی ہے۔

امام حسنؑ نے اقتدار چھوڑ کے اسلام کیسے بچایا؟

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقتدار معاویہ کا حتمی مقصد تھا اور اسلام مقصد برآوری کا وسیلہ۔ اس کے برخلاف امام حسنؑ کے لئے 'اسلام' 'مقصد' تھا اور اقتدار اس کا ایک ممکنہ وسیلہ، اس لئے جب آپ نے یہ دیکھا کہ اقتدار میں رہنے سے نہیں بلکہ اقتدار چھوڑ دینے سے اسلام کی حفاظت ہو سکتی ہے تو آپ اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔

اقتدار چھوڑنے سے اسلام کا تحفظ کیوں کر ہوتا ہے؟ سب سے پہلے اس نکتہ کی وجہ سے جس کا اشارہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں کہ یہی ایک ایسا طریقہ تھا جس کے ذریعہ حضرت معاویہ کی اصلیت سے نقاب اٹھائی جاسکتی تھی اور 'تہذیب معاویہ' کے طلسم کو توڑا جاسکتا تھا، اس کی وقتی کامیابی ابدی شکست میں تبدیل ہو سکتی تھی اور اس کی تہذیب رسوائے تاریخ ہو سکتی تھی۔

دوسرے یہ کہ اگر امام حسنؑ بھی اسی انداز میں معاویہ کے مقابل آتے تو ممکن تھا کہ عوام 'حق' و 'باطل' کی اصل جنگ کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے اور ممکن تھا کہ تاریخ اس جنگ کو محض 'حصول اقتدار' کی ایک جنگ کا نام دے دیتی۔

امام حسنؑ اس جنگ کو 'حکومتی جنگ' کے بجائے 'عوامی جنگ' کی شکل دے دینا چاہتے تھے، اقتدار سے اقتدار کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ 'حقیقت' کے ذریعہ 'اقتدار' کی سرکوبی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اسی جنگی حکمت عملی (اسٹریٹیجی) کا تکملہ کر بلا ہے۔ امام حسنؑ نے جس جنگ کا آغاز کیا تھا امام حسینؑ نے اسے انجام کو پہنچایا۔ امام حسینؑ نے کر بلا میں اقتدار کو اپنے لہو سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح سرنگوں کیا کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں اس کا سراونچا نہیں ہو سکتا۔ یوں تو معرکہ کر بلا کے عظیم ترین مجاہد (ہیرو) امام حسینؑ تھے مگر جنگی حکمت عملی کا آغاز امام حسنؑ ہی نے کیا تھا۔

'ظلم' سے 'مظلومیت' اور 'تلوار' سے 'خون کا مقابلہ'

امام حسنؑ نے ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے اسلحہ اور شمشیر کا مقابلہ خون سے کرنے کی بنیاد

رکھی، امام حسینؑ نے اسے نتیجہ کی آخری منزل تک پہنچایا۔ یہ سوچنا درست ہے کہ امام حسنؑ نے صلح کی تھی اور امام حسینؑ نے جنگ۔ مگر امام حسنؑ نے اپنی صلح کے ذریعہ ایسی راہ عمل کا تعین کر دیا تھا جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ تھا جنگ، شہادت اور فتح حسینؑ۔ امام حسینؑ کا عمل امام حسنؑ کی پالیسی کا تسلسل ہے۔ یہ امام حسنؑ ہی تھے جنہوں نے ”ظلم“ کے مقابلے میں ”مظلومیت“، شمشیر کے مقابلے میں ”خون“، اقتدار کے مقابلے میں حقیقت اور ”تاج“ کے مقابلے میں ”عوامی مجاہدہ“ کا آغاز کیا اور امام حسینؑ نے اسی طے شدہ عمل کو بام عروج تک پہنچایا۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی اس حکمت عملی سے ایک کثیف حکومت رسوا ہوئی۔ اس سے بھی اہم یہ کہ اسلام اور نام نہاد حکومت کی کارستانیوں کے درمیان ایک خط فاصل قائم ہو گیا۔ یہی ہمارے پیشوایان دین کی معرکہ آرائی کی سب سے بڑی فتح اور کامیابی ہے۔ یہ کام کسی طرح بھی فوجی اقتدار کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا، نہ ہی اس زمانے کے سیاسی حالات اس کے لئے سازگار تھے۔ امام حسنؑ نے دیکھا کہ فوجی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے حالات مکمل طور پر معاویہ کی موافقت میں ہیں۔ اگر غیر متوازن مسلح مقابلہ میں وہ اور ان کے رفقاء شہید بھی ہو جائیں تو اس شہادت سے کوئی مفید پہلو برآمد نہیں ہوتا کیونکہ اب تک نفاق کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب ہٹی نہیں ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ آئندہ کی نسلیں اور تاریخ اس جنگ کو حاکم شام اور حاکم عراق کے درمیان دولت و اقتدار کی ایک عام جنگ سے تعبیر کر کے رہ جائیں۔ اسی وجہ سے امام حسنؑ نے اپنی صلح کے ذریعہ ایک طرف تو اس جنگ کو دو حاکموں کی جنگ کے بجائے ”عوام“ اور ”حکومت“ کی جنگ کی شکل دے دی، دوسری طرف اپنی بیٹی کو محفوظ رکھا تا کہ اظہار حقیقت ہو سکے اور جنگ کی صورت تبدیل ہو کر ”اقتدار“ کے مقابلے میں ”اقتدار“ کے بجائے ”حکومت“ کے مقابلے میں ”عوامی معرکہ“ کی صورت اختیار کر لے اور ایک وقت ایسا آئے جب امو یوں کے مکروہ چہرے پر پڑی ہوئی اسلام کی جعلی نقاب تار تار ہو جائے اور ان کی اصلی صورتیں بے نقاب ہو جائیں اور وہی صحیح وقت ہوگا جب شہادتیں کا رساز ہوں گی۔ امام حسینؑ اسی بیٹی کو قلیل قوت کے ساتھ حکومت

سے ٹکرائے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دو حاکموں کی جنگ تھی کیونکہ ”نفاق“ کے مکروہ چہرہ سے نقاب ہٹ چکی تھی، حقیقت ظاہر ہو چکی تھی اور ظلم رسوا ہو چکا تھا۔

اسی لئے لبنان کے عالم و مجاہد اعظم علامہ شرف الدین نے لکھا ہے: ”عقلندگی نظر میں روز سابط (یوم صلح امام حسنؑ) کی فداکاری کے واقعات روز عاشورا سے زیادہ مستحکم ہیں۔ یوم عاشور کی شہادت پہلے تو حسنی شہادت ہے، بعد میں حسینی ہے کیونکہ یہ امام حسنؑ ہی تھے جنہوں نے تحریک عاشورا کے وجود میں آنے کے لئے راہ ہموار کی اور اس تحریک کے نتائج کو زمانے کے آگے پیش کرنے کے قابل بنایا۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا عمل بتاتا ہے کہ حق و باطل کی طویل مدتی جنگ کا مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ زمان و مکان کے تقاضے سے حکمت عملی اور طریقہ جنگ میں فرق ہوا ہے کیونکہ ہر جنگ کا طریقہ اور نقشہ اپنی اور دشمن کی طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد مرتب کیا جاتا ہے۔ لہذا کبھی مسلح مقابلہ کا رگر ہوتا ہے اور کبھی اسلحوں کے مقابلے پر مظلومیت نیز شمشیر کے مقابلے پر خون سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

امام حسینؑ، سید الشہداء

تلوار کے مقابلہ میں خون کے حکمت ساز

امام حسنؑ نے ”صلح“ کو جنگی حکمت عملی (اسٹریٹجی) بنایا تھا اور امام حسینؑ نے ”شہادت“ کو، مگر یہ دوا لگ نقشے نہیں ہیں بلکہ انھیں ایک ہی نقشہ کے ”دو حصے“ سمجھنا چاہئے۔ ۱۱ھ میں معاویہ، یزید کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور امام حسنؑ کی ماہرانہ جنگی حکمت عملی کے نتیجہ میں ”نفاق“ کے چہرہ کو اپنی آڑ میں چھپانے والی نقاب پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ امام حسینؑ کے لئے یہی موقع تھا کہ براہ راست مقابلہ کر کے یزیدیت کو اپنے خون کے سمندر میں غرق کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

امام حسینؑ نے مقابلہ کیوں کیا؟

اسلام کے خط مستقیم سے انحراف کم و بیش پیغمبر اسلام کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ ”امامت“ کو کنارے کر کے اس کی جگہ ”خلافت“ نے لے لی تھی مگر معاویہ کے زمانے سے ”خلافت“ بھی تبدیل ہو کر ”سلطنت“ کی شکل میں آ گئی تھی اور دنیاۓ اسلام میں قیصر و کسریٰ کا نظام رائج ہو گیا تھا اور یہ ابوسفیان کا خون اور تہذیب قیصر و کسریٰ کا وارث ”خليفة المسلمين“ کے نام سے مسند خلافت پر قابض ہو کر ایک خطرناک تغیر کو جنم دے رہا تھا اور قالب اسلام میں جاہلیت کا زہر پھیلا رہا تھا اور اسے ”دین محمدی“ کے نام سے پیش کر رہا تھا۔ اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ چند ہی نسلوں میں اصل اسلام، طاقِ نسیاں کی زینت بن جائے گا اور بدکار حکمرانوں کا کردار نمونہ اسلامی سمجھا جانے لگے گا۔

اس خطرے کے احساس سے معاشرہ قطعی بے تعلق تھا۔ اس پر حالات ایسے تھے کہ معاشرے کے اندر ”حق“ پر ”مکاری“ کو اور ”حقانیت“ پر ”سیاست“ کو فتح حاصل تھی، ”عرفان“

پر ”جہل“ غالب تھا۔ اسلامی قلمرو کے اکثر علاقوں کے عوام جو حجاز سے کافی فاصلے پر تھے حقیقت اسلام سے ناواقف تھے، دمشق کے محل میں تخت سلطنت پر ٹھٹھا سے بیٹھنے والے خلیفہ کو وہ مجسمہ اسلام سمجھتے تھے اور اس کے خلاف کھڑے ہونے کو وہ ”رہبر اسلامی“ کے خلاف بغاوت سمجھتے تھے۔ حجاز، مکہ، مدینہ، عراق اور خراسان کے عوام نسبتاً زیادہ آگاہی رکھنے کے باوجود انتہائی حالات سے خوفزدہ تھے۔ ایک تنہا کوفہ بچا تھا مگر وہ شام کی منظم فوج سے مقابلہ کا متحمل نہ تھا۔ ”مرجی“، ”صوفی“ اور ”جبری“ جیسے نئے نئے فرقے اور مسلک اپنے رنگارنگ نظریات و قیاسات کے متعلق عوام کے سامنے طرح طرح کی توجیہیں اور جواز پیش کر رہے تھے۔ ۱۱ھ کے دوران تقریباً ایسے ہی حالات کا وجود تھا اور عوام کے ذہنوں کو سلا دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

امام حسینؑ ان حالات سے مقابلہ، دین کے مورچہ کی حفاظت، اسلام کی اصلیت کے تحفظ، ظلم اور استبداد کو مٹانے اور اسلام کو محل نشین خلیفہ کے پنجے سے آزاد کرانے کے لئے حق پرستوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب پیروان حق کے لئے باطل کی قوتوں پر فتح پانا ممکن نہ تھا، ظلم کو اس طرح رسوا کرنا کہ وقت کی رفتار کے ساتھ اس کا نام و نشان مٹ جائے، جس وقت فوجی قوت سے بساط ظلم پلٹنا ممکن نہ ہو، اس وقت شہادت اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی اپنی اور اپنے عزیزوں کی زندگی کو قربان کر کے ظلم کو رسوا اور ظالم کو بے نقاب کریں۔ لہذا امام حسینؑ نے اسی طریقہ کا انتخاب کیا۔

البتہ امام حسینؑ کے مقابلہ پر اس وقت تین قسم کے گروہ اور تین انداز کے طرز فکر تھے:

(الف) یزیدی۔ وہ لوگ جو حق کے مقابلہ میں مورچہ بند، بندہ ظلم و جور، صاحبان زور و زور، خود سر اور شتمگر لوگوں کے نمائندے تھے۔

(ب) گروہ ناصحین و موافقین۔ جو سمجھوتے، نرمی اور مصلحت اندیشی کے حق میں تھے۔

(ج) عام لوگ۔ جو ان معاملات سے بے خبر اور صرف ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

تاریخ میں جب بھی حق و باطل کے درمیان جنگ ہوئی ہے، ہر بار ان تینوں گروہوں کا وجود بھی ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ متذکرہ بالا گروہ دوم سے متعلق تھے انھوں نے امام حسینؑ کو نصیحت

کی اور مشورہ دیا کہ وہ مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے یزید سے سمجھوتہ کر لیں، مگر امام حسینؑ شہادت اور قربانی کی راہ کا تعین کر چکے تھے لہذا وہ اسی راہ پر آگے بڑھے اور اپنی امامت کی خصوصیت کو انھوں نے برقرار رکھا۔

شکست میں فتح

بہ ظاہر کربلا کی جنگ آدھے دن میں ختم ہو گئی۔ تمام انقلابی شہید ہو گئے سوائے کربلا کے ان چند پیغامبروں کے جو پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ انقلابی شہداء، کربلا میں اپنے خون میں غلطالٹ موحوب تھے مگر انقلاب بیدار ہو چکا تھا۔ پیروانِ دین خاک و خون میں لت پت پڑے تھے مگر دینِ نجات پا چکا تھا۔ بہ ظاہر یزید کو فتح ضرور حاصل ہوئی تھی مگر تاریخ کی گہرائی میں وہ ایک بدترین شکست خوردہ انسان تھا اور حسینؑ کو شکست ظاہری کی صورت میں ایک عظیم ترین فتح حاصل ہوئی۔ موت نے اپنے ہاتھوں سے انھیں حیاتِ ابدی کا تحفہ پیش کیا۔

حسینؑ اور حسینیوں کے کارناموں کا نتیجہ شکست یا فتح؟

ہر تحریک اور اقدام کی شکست و فتح کو اس کے مقاصد (کی کامیابی اور ناکامی) کے لحاظ سے طے کرنا چاہئے۔ حسینؑ کی شہادت سے یزید کے تین مقاصد تھے۔ پہلا مقصد تھا آواز حق بلند کرنے والوں کا گلا گھونٹ کر صدائے حق کو دبا دینا، دوسرا مقصد تھا نظامِ اموی اور خاندانِ ابوسفیان کی ہر مخالفت کو کچل دینا، اور تیسرا مقصد تھا ابوسفیان کی نیابت میں ”اسلام محمد ﷺ“ سے انتقام لینا۔ مگر ان میں سے اس کا کوئی مقصد بھی پورا نہیں ہو سکا اور خونِ حسینؑ نے نقیبانِ حق کی فریاد و احتجاج کو پر زور بنادیا۔ شہادتِ حسینؑ تختِ اموی کو متزلزل، اموی سیاسی طاقتوں کو سوسال سے بھی کم عرصہ میں فنا اور تاریخ میں یزیدیت کو ذلیل و خوار کرنے کا موجب بن گئی اور صدائے حق بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

اس کے مقابلے میں امام حسینؑ کا مقصد ”حقیقی اسلام“ کو ”حکومتی اسلام“ سے جدا کر دینا تھا تاکہ یزیدیوں کے عمل کو ایک فاسد حکمران کا کردار ہی سمجھا جائے، اس پر اسلامی نمونہ کا دھوکا نہ ہو۔ امام حسینؑ نے اپنے ارادہ اور اپنے مقصد کو قوت بخشی اور سرحدِ اسلام پر اپنے ”خون“ کی گہری اور امنٹ لکیر کھینچ کر اسلام کو حکمرانوں کے کردار سے جدا کر دیا۔ بہت سے مسلمان یزید سے قبل کے خلفاء کے کردار کو ”اسلام کا نمونہ“ اور ”سند“ سمجھتے ہیں، مگر قرباۃ حسینؑ نے یزید اور دیگر حکمرانوں کے کردار اور مثالی کردارِ اسلامی کے درمیان جو بعدِ مشرقین تھی اسے اظہر من الشمس کر دیا، یہاں تک کہ اہلسنت بھی یزید اور بعد کے خلفاء کے کردار کو مستند نہیں مانتے۔

امام حسینؑ کا مقصد تاریخ میں یزید کو رسوا کرنا، حقیقتِ اسلام کا تحفظ اور اسلام کے سچے پیغام کو بطور امانت تاریخ کے حوالے کر دینا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یزید اپنے کسی مقصد میں بھی کامیاب نہ ہو سکا جب کہ حسینؑ اپنی شہادت کے ذریعہ اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہے اور یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ کربلا کی جنگ میں جسے عظیم ترین فتح حاصل ہوئی، وہ حسینؑ تھے اور جسے بدترین شکست نصیب ہوئی اور جو نیست و نابود ہو گیا وہ یزید تھا نیز یزیدیت تھی۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جو فقیاب ہوتا ہے، وہ پشیمان نہیں ہوتا اس کے برعکس جو شکست کھاتا اور نقصان اٹھاتا ہے وہ حسرت اور پشیمانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم تاریخ سے پوچھتے ہیں کہ پشیمان کون ہوا: حسینؑ یا یزید؟ یہ معرکہ صحرائے کربلا میں فتح و شکست کے تولنے کا ایک معیار ہو سکتا ہے۔

ابھی کربلا کی جنگ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یزید نے اسیرانِ کربلا کو مدینہ واپس بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دمشق اور جہانِ اسلام کے تمام اطراف و جوانب میں شہیدوں کے لہو کے قطروں سے انقلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ اسیرانِ کربلا کی واپسی یزید کی پشیمانی اور احساسِ شکست کی علامت ہے۔ زینبؑ و سجادؑ کی خواہش ہے کہ یادِ حسینؑ و یادِ کربلا ہمیشہ زندہ رہے جبکہ یزیدی چاہتے ہیں کہ ”کربلا“ جلد از جلد ذہنوں سے محو ہو جائے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ شہیدوں کے خون کی طغیانی میں انہیں اپنی فتح تنکے کی طرح بہتی اور

خطرناک امواج شکست اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

واقعات کر بلا کو ابھی پانچ برس بھی نہ گزرے تھے کہ یزید واصل جہنم ہوا اور اپنے باپ اور دادا کے تخت پر یزید کا بیٹا معاویہ آیا۔ اس کے برسر اقتدار ہوتے ہی خاندان ابوسفیان کی سلطنت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ مروان اور اس کی اولاد نے زمام حکومت سنبھالی۔ مگر انہیں نئے انقلابات کا سامنا کرنا پڑا اور تمام تحریکوں کو لے کر اٹھنے والوں کا نعرہ تھا: ”انتقام خون حسین“ چنانچہ انقلاب مختار، قیام ابراہیم، قیام تواہب بن سلیمان بن صردخزاعی وزید و یحییٰ وغیرہ نے اموی حکومت کو لرزہ بر اندام کر دیا یہاں تک کہ سوسال سے بھی کم عرصہ میں بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ حسینؑ اور طلبہ گاران انتقام خون حسینؑ کے نام پر عباسی برسر اقتدار آ گئے۔

امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟ اس لئے کہ امت کو بیدار کریں۔ امام حسینؑ اپنی سچائی کے ذریعہ اور اپنا خون بہا کر امت اسلامی کو خواب غفلت سے چونکا نا چاہتے تھے، کر بلا کے واقعات سے پہلے لوگوں کی بے تعلقی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جمعہ کی نماز غلیفہ نے بدھ کے روز پڑھوائی اور سبھوں نے پڑھی، مگر کر بلا کے بعد یہ تمام انحرافات اور تحریکیں سوسال سے بھی کم عرصہ میں ختم ہو گئیں۔

کر بلا میں خون کا ایک دھماکہ ہوا اور اس عظیم دھماکہ کی لہروں نے تمام قلمرو اسلامی میں پھیل کر ایک لرزہ پیدا کر دیا۔ عرصہ تاریخ میں یزید کو رسوا کیا یہی نہیں بلکہ اس عظیم دھماکہ سے تاریخ کے سنگلاخ سینہ سے ایک ایسا چشمہ پھوٹا جس کی روانی سے اسلام ہمیشہ ہمیشہ کسب حیات کرتا رہے گا۔

تاریخ میں کر بلا کا دوام:

ہابیل اور قابیل کی طاقتوں میں تصادم

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

(علامہ اقبال)

اسلام جس کا اعتقاد توحید اور قیامت پر ہے دنیا کے سلسلے میں خالق کے شعور، ارادہ اور مقصد کا بھی قائل ہے اور ”وحدتِ تاریخ“ کو بھی مانتا ہے۔ تاریخ گذشتہ واقعات کا ایسا مجموعہ ہے جو اتفاقی طور پر پیدا ہو کر ختم نہ ہو جانے والی ہے بلکہ واقعات کا ایک تسلسل ہے جو پیہم رواں ہے جیسے ایک کارواں، ایک چشمہ جو انسان کی زندگی کے آغاز کے ساتھ جاری ہوا اور ایک مستقل روانی کے ساتھ مخصوص سمت میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس چشمہ امروزی افراد میں ہر گزرا ہوا ”کل“ ایک ”آج“ کو جنم دیتا ہے۔ ہر حال ماضی کے پیٹ میں رہتا ہے اور ہر ماضی حال کی ”پیٹھ پر“ ہوتا ہے۔ روئے زمین پر تاریخ انسان کے ساتھ حرکت کرتی ہے اور جو قدریں تاریخ پر حکمرانی کرتی ہیں انھیں ”سنن الہی“ کہتے ہیں۔ ان ”سنن الہی“ میں ایک یہ بھی ہے کہ ”حق“ ہمیشہ ”باطل“ سے نبرد آزما رہتا ہے، ”علم“ ”جہل“ سے برسر پیکار رہتا ہے۔ ایمان کفر سے مصروف جنگ رہتا ہے اور انحراف سے بنیاد الہی کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد سے تاریخ، کشاکش ہابیل و قابیل کے محور پر گھومتی رہتی ہے۔ ہر دور ہر عہد اور ہر جگہ میں حق انبیاء و مومنین کی سرکردگی میں باطل کے تاجداروں سے مصروف پیکار رہا ہے۔ ابراہیمؑ و نمرود، موسیٰؑ و فرعون، اور محمد ﷺ و ابولہب و ابوجہل و ابوسفیان۔ یہ تمام مراحل ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں، یہ

جنگ ایک گزر جانے والی جنگ نہیں بلکہ ایک تاریخی تسلسل ہے جو ہر دور میں دہرایا جاتا ہے۔
 ”حق“ و ”باطل“ کی یہ جنگ فلسفہ تاریخ کا رخ اسلام کی سمت موڑتی ہے۔ چنانچہ کربلا اس جنگ کی ایک عظیم گچی اور نمایاں میدان ہے۔ جس نے ”حق“ و ”باطل“ کی جنگ کے ایسے ایسے پہلو اجاگر کئے ہیں کہ اس کے بعد سے ہونے والی ہر جنگ ”حق“ و ”باطل“ کو کربلا سے منسوب کیا جانا چاہئے، کربلا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو تاریخ بشر کے آغاز کے ساتھ جاری ہوا اور جو حال کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا مستقبل کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے۔

حسینؑ، روحانی تاریخ کے وارث

”زیارت وارث“ درحقیقت فلسفہ تاریخ کے بارے میں شیعہ نقطہ نظر کا اعلان ہے۔ یہ زیارت پکار پکار کر کہتی ہے کہ حسینؑ ایک فرد نہیں بلکہ پیوستہ تاریخ کی روحانی کے وارث ہیں۔ حسینؑ اس پرچم کے وارث ہیں جو تاریخ بشری میں باطل، ظلم، زور، انحراف اور جاہلیت کی قدروں کے خلاف ہونے والی جنگ میں ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا حسینؑ تک پہنچا ہے۔ وہ وارثِ آدم، وارثِ نوح، وارثِ ابراہیم، وارثِ موسیٰ، وارثِ عیسیٰ، وارثِ حضرت محمدؐ، وارثِ علیؑ اور وارثِ حسنؑ ہیں۔ اگر قرآنی صفحات کا مطالعہ کر کے دیکھا جائے کہ ہائیل، نوح، ابراہیم اور موسیٰ کن قدروں کے علمبردار تھے اور کن قوتوں اور قدروں کے خلاف مصروف و غارتھے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں نسبتاً کمتر مگر ایک کربلا کا وجود تھا۔ زمانے کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے جب ہم قم کے عظیم مظاہرہ اور ۷۱ ارشہر یورپی کامیابیوں اور خونین شہر آبادان کے مناظر تک پہنچتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ”کل“ کی کربلا کھینچ کر ”آج“ کے حالات میں ڈھل گئی ہے اور ہم یہ مان لیتے ہیں کہ کربلا کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور کربلا کی تکرار ہر دور میں ہوتی رہے گی۔

بظاہر ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور حسینؑ کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، مگر حسینؑ براہ راست آدمؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے وارث ہیں اور نمرود و فرعون صرف اپنی قوت کا استعمال کرنے

والے ہیں جو ان انسانوں کو جنہیں صرف خدائے واحد کے آگے جھکنا اور اس کی عبادت کرنا چاہئے، اپنے آگے جھکانا چاہتے ہیں اور ان سے اپنی پرستش کروانا چاہتے ہیں۔ موسیٰؑ اسی اصول کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور فرعون سے ٹکرا گئے تھے تاکہ انسانوں کو طاغوت کی بندگی سے نجات دلائیں۔ لہذا موسیٰؑ نے دربار میں فرعون سے مطالبہ کیا:

”أَنۡ اذۡنُوا لِيَ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوْلٌ اٰمِیۡنٌ“ (سورہ دخان، آیت: ۱۸) [بندگان خدا کو مجھے واپس کر دے، میں تیری طرف بھیجا ہوا خدا کا امین ہوں۔]

”أَنۡ عَبَدْتَ بَنِیۡ اِسۡرَآئِیْلَ“ (سورہ شعراء، آیت: ۲۲) [تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے۔] حسینؑ بھی ظلم و جور، قوت و اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ایک عظیم حکومت کے خلاف تنہا کھڑے ہو گئے۔ گویا حسینؑ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارے پاس دین نہیں ہے تو کم سے کم دنیا میں تو آزاد رہو۔

آج بھی انسان کی مخالف طاغوتی طاقتیں، مشرقی اور مغربی سامراجیت کی شکل میں، ریگن، برژنف اور صدام کی صورت میں کمزور قوموں کو جو یزید کے زمانے کے مسلمانوں اور بنی اسرائیل کی مانند ہیں، اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اور حسینی طاقتیں یزیدانہ زمانہ سے برسرِ پیکار ہیں۔ پیروی حسینؑ میں مائیں اپنے کسن اور جوان یعنی غلامان علی اکبر علی اصغر کو اسلام پر قربان کر رہی ہیں۔ آپ غور کریں کہ آبادان اور خونین شہر میں حق و باطل کے درمیان محاذ جنگ پر کیا ہورہا ہے؟

موسیٰؑ کے مقابلہ میں فرعون کا ردِ عمل کیا تھا؟ مادی طاقتوں کے ذریعہ حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کرنا: ”ذَرُونِیۡ اَقۡتُلۡ مُوسٰی وَّلَیۡدَعۡ رَبِّہٖ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوْ اَنۡ یُّظۡہِرَ فِی الْاَرۡضِ الْفَسَادَ۔“ (سورہ مومن، آیت: ۲۶) [فرعون نے کہا: ”چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر دوں، مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آیا وہ تم لوگوں کو نئے نظریات اور نیا عقیدہ دیتا ہے یا زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔] امام حسینؑ بھی اسی ردِ عمل سے دوچار تھے۔

ناخ التواريخ کے مطابق:- یزید نے والی مدینہ ولید کو لکھا: ”اگر حسینؑ ابن علیؑ بیعت نہ کریں تو اس خط کے جواب میں ان کا سر میرے پاس بھیج دو“ جس وقت حسینؑ، یزید کے والی، ولید کے سامنے تھے، مروان نے کیا کہا؟ اس نے کہا: ”حسینؑ پر نظر رکھو تا آنکہ یا تو وہ بیعت کریں یا ان کا سر قلم کر دو“ (۱) جواب میں امام نے کہا: ”وَيْلَكَ يَا ابْنِ الزُّرْقَاءِ أَنْتَ تَأْمُرُ بِضَرْبِ عُنُقِي كَذَبْتَ وَلَوْ مِثْ“ یعنی ”اے ناپاک اور گندی اولاد! تو میری موت کا حکم دیتا ہے؟ خدا کی قسم تو نے جھوٹ کہا اور اس کے لئے تجھے ملامت بھگتنی پڑے گی۔“ (۱)

یزیدوں، فرعونوں، ریگنوں، آریامہروں اور صداموں کا یہی شیوہ مشترک ہے کہ اسلحہ کے زور پر نقیبانِ حق کو خاک و خون میں غلطاں کر دیتے ہیں تاکہ وہ موجودہ حالات کو اپنے موافق نہ بنا سکیں اور اسے وہ فساد اور بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ اس کی واضح اور آشکار ترین تصویر کر بلا میں پیش کی گئی۔ حسینؑ نے خون کے طاقور طوفان سے دشمن کے اسلحے اور ثروت، اقتدار اور خیرہ سری کی اس تاریخی منطق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس حسینی مہم کو گزرے چودہ سو برس ہو گئے مگر آج بھی جب کبھی کہیں حق باطل سے ٹکراتا ہے تو باطل اسی اصول پر کار بند ہوتا ہے اور پاسبانِ حق بھی محافِ جنگ پر شجاعت کر بلا دہراتے ہیں اور خون کے زور سے شمشیر پر فتح حاصل کر کے پیروی حسینؑ کرتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کے دھارے پر کر بلا کا تسلسل قائم رہتا ہے۔

فرعون کے متعلق قرآن کہتا ہے: ”جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضَعِفُ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ“

(سورہ قصص، آیت: ۴)

”فرعون کے خاص جرائم میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ انسانوں کو نسلی اعتبار سے تقسیم کرتا تھا اور گروہوں کو دبائے رکھتا تھا۔“

۶۱ھ میں امام حسینؑ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جاہلیت کی بنیادیں، قومی اور قبائلی عصبیتیں دوبارہ سر اٹھا رہی تھیں۔ امتِ اسلامی کے کمزور افراد ظلم و استبداد کا شکار تھے۔ ایسی صورت میں امام حسینؑ بھی حضرت موسیٰ کی طرح اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱) ناخ التواريخ، حالات سید الشہداء، ص ۱۵۶

یہ حقیقت ہے کہ امام حسینؑ آدمؑ ونوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰ کے وارث تھے۔ لیکن کیا آج امریکہ، روس اور ان کے نمک خواروں کی سامراجیت کا مجرمانہ طرزِ عمل کچھ مختلف ہے؟ ایسے موقع پر وارثانِ مشعل کر بلا اور پیروانِ حسینؑ آج بھی خمینی یا ان کی طرح باطل قوتوں سے ٹکراتے ہیں۔ یہ ہے تاریخ کے امروز پر کر بلا کی تکرار اور کر بلا کا تسلسل۔

یزیدوں، فرعونوں اور نمودوں کے عمل کے جواب میں حسینؑ، موسیٰ، ابراہیمؑ اور ان کے پیرووں کا رویہ کیا ہے۔ ان کا رویہ ایک ہی منطق سے ماخوذ رہا ہے یعنی ”لا“ اور ”الا“، ”ہاں“ اور ”نہیں“۔ ہر ”زور“، ”ستم“، ”باطل“ اور ”طاغوت“ کے مقابلے پر ”نہیں“ اور ”خدا“ ”حق“ ”انصاف“ اور ”سچائی“ کے سامنے ”ہاں“۔

حق کے انہیں علمبرداروں کی ”نہیں“ تاریخ کی جان اور قوت کا سبب رہی۔ یہی منطق ”نہیں“ اور ”ہاں“ تھی جو زندگی میں تحرک و روانی قوت کا سبب بن گئی۔ ان حق کے علمبرداروں کے ہاتھ میں ”نہیں“ وہ شمشیر تھی جس نے زندگی کے تمام سماجی، سیاسی اور مذہبی بد بختیوں کو جڑ سے ختم کر دیا۔ پیغمبرانہ ”ہاں“ ہمیشہ ایک ”نہیں“ کے ساتھ ہوتی ہے۔

حسینؑ کا انکار اور ”نہیں“ موسیٰ اور ابراہیمؑ کی ”نہیں“ ہے۔ یہ نہیں توحید کی گہرائیوں سے پھوٹی ہے۔ اس میں ”ہاں“ بننے کا امکان نہیں پایا جاتا اس لئے کہ اگر یہ ”نہیں“ ”ہاں“ بن جائے تو جتنی چیزیں برائیوں کی نفی کرتی ہیں وہ سب اثبات میں بدل جائیں۔ ”نہیں“ تمام جعلی نقابوں کو تار تار کر کے اصل حقیقت کو جلوہ گر کرتی ہے۔ انسان اور عالم کا ارتقا بغیر اس ”نہیں“ کے ممکن نہیں ہے۔ آدمؑ کے وارث حسینؑ سے جب ابنِ زبیر نے پوچھا کہ اگر یزید بیعت کی دعوت دے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ”میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔“ (۱) آپ نے محمد حنفیہ سے مخاطب ہو کر اعلان فرمایا: ”يَا أَخِي وَاللَّهِ لَوْ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا مُلْجَأٌ وَلَا مَأْوَى لَمَّا بَايَعْتُ يَزِيدَ ابْنِ مُعَاوِيَةَ“

(۱) کامل ابن اثیر، ج ۱ ص ۷ طبع مصر ۱۳۰۳ھ

[خدا کی قسم اگر میرے لئے ساری دنیا میں کہیں بھی امن اور پناہ کی جگہ نہ ہوتی بھی میں فرزند معاویہ کے ہاتھ پر ہرگز ہرگز بیعت نہ کروں گا۔]

حسینؑ کے اس انکار اور اس نہیں نے تاریخ کی بیکراں فضاؤں میں ابد تک کے لئے ایک گونج پیدا کر دی ہے۔ ”نہیں“، یعنی باطل، طاغوت، انحراف اور ہر اس چیز، ہر اس قوت کے مقابلے میں احتجاج جو حقیقت اور خدا سے لکراتی ہے اس کے بعد ”ہاں“، یعنی صرف خدا کے حضور میں اور منشاء الہی کے آگے اقرار۔

”ہاں“ اور ”نہیں“، یعنی ”اقرار“ و ”انکار“ کی یہی منطق ہے جو زندگی کو الیکٹران (electron) اور نیوٹران (neutron) کے ابتدائی مراحل سے لے کر روحانی اور معنوی مراحل کی بلندیوں تک انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور حیات انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔

واقعہ کربلا کے چودہ سو برس کے بعد آج بھی نسلِ حسینی کا ایک نائب امام و رہبر زمانہ کے یزیدوں کے مقابلہ میں اسی ”نہیں“ کی تکرار کر رہا ہے۔ اس ”نہیں“ میں ایسا یقین ہے کہ جو بڑی بڑی جابر حکومتوں کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ حسینؑ کی پیرو ملت ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ”كَأَنَّهُ بُنْيَانٌ مَّرْصُومٌ“ ہے جو مشرقی و مغربی قوتوں کے مقابلہ پر کھڑی ”نہیں“ کی تکرار کر رہی ہے اور نسلِ حسینی کا اپنے قبیلہ کی سنت سے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ کربلا پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ فرعون قسم کے لوگ علمبردارانِ حق کی محکم حکمت عملی اور ان کی کامیابیوں کے خلاف طرح طرح کے بہتان، تہمتیں اور الزامات تراشتے ہیں۔ موسیٰ کو فرعون نے کبھی ”ساحر کذاب“ کہا، کبھی ”أَنَّهُ لَمَجْنُونٌ“ یعنی دیوانہ اور کبھی ”بُغَاةٌ فَسَاةٌ“ یزید بھی وارثِ موسیٰ حسینؑ کو باغی، فساد اور ہنگامہ ساز وغیرہ مشہور کرتا ہے اور چودہ سو برس بعد آج بھی علمبردارانِ حق کو جن اتہامات و الزامات کا سامنا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں باطل کے اصولِ جنگ، حربوں اور طریقہ کار میں سابقہ مماثلت باقی ہے اور زمانے کی تبدیلی بھی اس میں کوئی فرق نہ پیدا کر سکی۔

حالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ یہ فرعونی حکمرانی کا دور ہے۔ اس کے قلمرو میں ہر ظلم و ستم اور خود پرستی کی حکمرانی ہے۔ اس نے لوگوں کی آزادی سلب کر رکھی ہے اور نقیبِ حق موسیٰ کو مصر سے ہجرت پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

”فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔“

(سورہ قصص، آیت: ۲۱)

اور اب یزیدی دور ہے، اسلامی قلمرو میں ایک بار پھر ظلم و ستم، غصب اور غارتگری کا دور دورہ ہے، یزید حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہے اور حسینؑ فیصلہ کن انداز میں ایک بار ”نہیں“ کہتے ہیں۔ یزید امام وقت کے قتل کا حکم صادر کرتا ہے اور امام وقت اپنی عورتوں اور معصوم بچوں کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر مکہ آنے پر مجبور ہے۔

یزید نے کیا کیا؟

”فَازْسَلْ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ وَإِنَّهُمْ لَغَائِظُونَ وَإِنَّا لَجَمِيعٌ حَاذِرُونَ۔“

(سورہ شعراء، آیات: ۵۶-۵۳)

انبیاء کی تحریک کے مقاصد میں ایک مقصد انحراف کے تسلط سے بچاؤ تھا۔ زمانہ میں جب مختلف مضرت رساں اسباب کے نتیجہ میں انسانیت کا قافلہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے تو ایسے حالات میں خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے ایک جہاد کا آغاز کرتا ہے تاکہ دینِ الہی کے منور اور شفاف چہرے پر پڑے ہوئے فساد اور انحراف کے داغ دور کر دے۔

جس وقت امام حسینؑ نے تحریکِ کربلا کی ابتدا کی، اس وقت خدا کا آخری کامل ترین دین اسلام انحراف کے دہانے پر کھڑا تھا۔ مسندِ خلافت پر یزید کا قبضہ تھا، وہ ”خلیفہ“ کے نام سے مسلمانوں کا دینی رہنما تھا اور اس کا ہر عمل تمام مسلمانوں کے لئے مثالی اور نمونہ سمجھا جاتا تھا اور یہ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا کہ کسی وقت بھی صحیح اسلام کی صورت بدل جائے گی۔ ایسی صورت میں حسینؑ

وسعدت کے حصول کو بتایا ہے۔ حسینؑ اپنے مقصد کو نہی عن المنکر بتاتے ہیں۔ منکر کیا ہے؟ وہ کس چیز سے روک رہے ہیں؟ اندرونی طور پر اسلام کا دگرگون ہونا۔ کمزوروں کے اسلام کو طاقتوروں کے اسلام میں، اصلی اسلام کو چالو اسلام میں اور ربانی حقیقتوں کو سامراجی ڈھروں میں بدلنا۔

خدائی اسلام کی حقیقت کے تحفظ کے لئے امام حسینؑ اور ان کے رفقاء اپنی اور اپنے اعزاء کی جانیں قربانی کے لئے پیش کرتے ہوئے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس راہ میں موت ان کے لئے شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے، نیز شمشیر کے سایہ میں وہ ”حقیقت“ اور ”اصلیت“ کے روئے زیبا کا نظارہ کرتے تھے۔ انہوں نے وہ معرکے کئے جن سے کر بلا کے بعد بھی ان گنت کر بلاؤں کے معرکے سر ہوتے رہیں گے۔ اگر ہم ان واقعات کا نقشہ خود نظارہ کرنا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ محاذ جنگ کا معائنہ کریں، اسلام کے جاں نثاروں کے خیموں کو دیکھیں اور مجاہدوں کے معمولی گھروں میں جائیں اور دیکھیں کہ کس طرح کر بلا کا تسلسل جاری ہے اور امام حسینؑ کے وصیت نامہ میں واضح کئے گئے مقصد کے لئے مجاہدوں اور شہیدوں کے قافلے پر قافلے اپنی منزل مقصود یعنی محاذ جنگ پر موت کو گلے لگانے کو کس طرح یکے بعد دیگرے رواں ہیں اور کس طرح گولیوں کی بوچھاڑ میں ”اللہ اکبر“ کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حسینؑ کی بیروی میں اپنے خدا سے وعدہ کر چکے ہیں کہ وہ اسلام کی حفاظت کریں گے اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک اس عہد پر باقی رہیں گے۔ کس طرح مانیں غلامان علی اکبر و علی اصغر کو اسلام پر نثار کر رہی ہیں اور کس طرح زینب کی بیرو بہنیں شہزادی کی طرح اسلام کے لئے جاں نثاری اور فداکاری پر آمادہ ہیں۔

یہ ”کل یوم عاشور او کل ارض کربلا“ کا مفہوم ہے۔ کر بلا گذرا ہوا واقعہ نہیں جو اچھٹے میں واقع ہوا ہو، کر بلا مستقل روانی کا نام ہے، کر بلا ایک دائمی جنگ ہے، ہر زمانے اور ہر علاقے میں یزیدی قوتیں حق کے علمبردار اور پیروان حسینؑ کے مقابل صف آرا ہوتی ہیں اور حق و باطل کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ حسینی راہوں کے پیروہ لوگ ہیں جو حق و باطل کی جنگ میں عملاً شریک ہوتے ہیں، باطل کے خلاف مورچہ بندی کرتے ہیں، روشن اور قطعی

سیاست اختیار کرتے ہیں اور تحفظ حق کی غرض سے اپنی جان، مال و متاع سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ دسویں محرم ہی کو کر بلا ختم نہیں ہو گئی اور نہ ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ کر بلا ختم ہو گئی ہے اور اس جنگ کے عظیم مجاہدین مردہ ہیں، نہیں حسینؑ، عباسؑ، علی اکبرؑ، اور حرسب کے سب زندہ ہیں۔ ہر زمانے میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ ہمیشہ اس جنگ اور میدان جنگ کے واقعات کو دہرایا کرتی ہے۔ ایک فرزانہ اسلامی نے کس قدر سچی بات کہی کہ ”جب یہ حکم دیا گیا کہ حضرت عباسؑ کے روضے پر سرخ جھنڈا لہرایا جائے تو اس کا کیا مطلب تھا؟ یہی کہ جنگ جاری ہے اور پرچم اپنی جگہ پر ہے۔ آج اگر یزید نہیں ہے تو کیا ہوا، اس کی جگہ صدام ہے، سادات ہے اور ان کے علاوہ بھی لاتعداد چھوٹے بڑے یزید موجود ہیں اور جب تک ان کا وجود ہے حسینیوں کو چین سے نہیں بیٹھنا چاہئے جو پرچم تمہارے ہاتھ میں ہے یہ محض عباسؑ کا پرچم نہیں ہے بلکہ یہ وہ پرچم ہے جو تاریخ کی ابتدا سے دست بدست ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ لوگ کتنے احمق تھے جنہوں نے یہ سمجھا کہ یہ پرچم فرات کے کنارے گر چکا ہے، پرچم تو اپنی جگہ لہرایا ہے اور جنگ ابھی جاری ہے۔ کر بلا کا تسلسل جاری ہے ہر سال محرم ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ”جاننا ز آگے بڑھو، مشعل کر بلا گرنے نہ پائے۔“

انصار حسینؑ کی شجاعت

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام معرکہ کر بلا میں شجاعت کے اصلی مظہر ہیں، لیکن ان کے پرچم تلے بہادروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے۔ افق تاریخ پر سید الشہداء بدر کامل کی طرح چمکتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے چمکتے ستارے ہیں جو تاریخ کے اس عظیم معرکے کے علمبردار اور شہر حق، عدالت اور الہی سنتوں کے محافظ تھے۔

انصار حسین کے سلسلہ میں اس جگہ مولانا سید علی نقی صاحب کی کتاب ”شہدائے کربلا“ سے خلاصہ پیش کر رہا ہوں جو پاکستان میں شائع ہو چکی ہے۔^(۱) یہاں پر معرکہ کر بلا کے بہادروں کا (۱) یہ ہندوستان میں امامیہ مشن، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ مترجمہ

فہرست وار تذکرہ کیا جائے گا۔ شہداء کا ذکر ان کی ترتیب شہادت کی بنیاد پر ہے۔ روز عاشورا اسی ترتیب سے شہداء یکے بعد دیگرے میدان میں تشریف لائے اور انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ضمنی بات بھی بتاتا چلوں کہ شہداء کی تعداد کے بارے میں تاریخوں میں اختلاف ہے۔ ہم ان تمام شہداء کا ذکر کریں گے جن کا نام تاریخوں میں آیا ہے اور جو مقاتل اور روضہ میں مذکور تعداد ۷۲ سے کہیں زیادہ ہے۔

کربلا میں پہلا شہید کون تھا؟

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کربلا میں شہید ہونے والے پہلے مجاہد حر ابن یزید ریاحی تھے۔ ”مناقب“ میں ابن شہر آشوب یہی نظریہ ہے اور اکثر کتب ”مقاتل“ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ سپہرکاشانی اپنی ”ناسخ التواریخ“ میں اس بات کو مانتے ہیں کہ جناب حر سے پہلے عبد اللہ ابن عمیر کلبی شہید ہوئے۔ لیکن یہ دونوں نظریے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ طبری کی تحریر کے مطابق عبد اللہ بن عمیر پہلے شخص تھے جو یزیدی لشکری کے دو سپاہیوں یسار اور سالم کی مبارز طلبی کے بعد میدان میں تشریف لائے اور دونوں کو واصل جہنم کیا لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ عبد اللہ ابن عمیر اس موقع پر شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنے لشکر میں واپس آگئے اور بعد میں شہید ہوئے۔ طبری نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابن شہر آشوب نے ابن عمیر کو حملہ اولیٰ کے شہیدوں میں لکھا ہے یہ حملہ ظہر سے پہلے ہوا تھا۔ ”ناسخ التواریخ“ میں مولف ایک جگہ عبد اللہ بن عمیر کو روز عاشورا کا سب سے پہلا شہید بتاتے ہیں۔ اسی کے بعد ابن شہر آشوب کی پیروی میں شہداء کے سلسلہ کو جناب حر سے شروع کرتے ہیں جو مولف ”ناسخ التواریخ“ کے اچھی طرح غور و خوض نہ کرنے کا نمونہ ہے۔ اس کتاب میں اس طرح کے بہت سے نمونے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں پہلے شہید مسلم بن عوسجہ اسدی ہیں۔ ہم شہداء کے سلسلہ کو انہیں سے شروع کرتے ہیں۔

۱ مسلم بن عوسجہ الاسدی

جناب مسلم کو اصحاب حسینؑ میں خاص امتیاز حاصل ہے آپ کا پورا نام مسلم ابن عوسجہ ابن سعد ابن ثعلبہ ابن دودان ابن اسد ابن خزیمہ اسدی تھا۔

ابن عوسجہ اپنے قبیلہ کے سردار اور اشراف عرب میں تھے۔ عبادت اور زہد میں مشہور تھے لیکن وہ ایسے عابد نہ تھے جو گوشہ عبادت میں ذمہ داریوں سے اپنا دامن کھینچے ہوئے رہتے ہیں بلکہ وہ ایسے عبادت گذار تھے جنہوں نے اپنے خون سے وضو کر کے بہادری کا مظاہرہ فرمایا۔ مولف ”ابصار العین“ یہ مانتے ہیں کہ مسلم ابن عوسجہ نے پیغمبرؐ کی صحبت سے بھی کسب فیض کیا تھا، اور آپ صحابی تھے۔ مسلم ابن عوسجہ مرد میدان بھی تھے۔ آپ نے ۲۰ھ میں جب مسلمانوں نے خدیجہ ابن یمان کی سرکردگی میں آذربائجان (ایران) کو فتح کیا تو مسلم بھی اس معرکہ میں موجود تھے اور آپ نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔

جس وقت مسلم ابن عقیل حسینؑ کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ پہنچے تو مسلم ابن عوسجہ ان کے بہت ہی قریبی مددگار تھے جب ابن زیاد کوفہ پر مسلط ہو گیا اور مسلم بن عقیل نے ہانی کے گھر سے خفیہ مقابلہ کا آغاز کیا اور مجاہدین کو جمع کرنے لگے تو مسلم ابن عوسجہ نے مسلم ابن عقیل کے نمائندہ کے بطور لوگوں سے بیعت لی، لیکن تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد مسلم ابن عوسجہ کہاں تھے اور حسینؑ کی خدمت میں کیسے پہنچے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ جب کوفہ میں یہ خبر پہنچی کہ امام حسینؑ سرزمین عراق پر پہنچ گئے ہیں تو جناب مسلم بن عوسجہ نے اپنے کو خدمت امام حسینؑ میں پہنچا دیا ہو اور اس کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی امام کو تنہا نہیں چھوڑا۔ شب عاشور جب امام نے اپنے اصحاب کی گردن سے بیعت اتاری اور اجازت دے دی کہ جس کا جی چاہے وہ واپس چلا جائے تو مسلم ابن عوسجہ نے تمام اصحاب کی نمائندگی میں اعلان فرمایا: یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے امام کو خطرات میں گھرا چھوڑ کر واپس پلٹ جائیں۔

آپ نے فرمایا: کیا یہ ممکن ہے کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم خدا کی بارگاہ میں کیا جواب دیں گے؟ یہ ناممکن ہے۔ جب تک طاقت موجود ہے ہم آپ کی راہ میں تلوار چلاتے رہیں گے اور اگر ہمارے ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی تو جس طرح بھی ممکن ہوگا جنگ کرتے رہیں گے اور آپ کے ساتھ اپنی جان دے دیں گے۔

صبح عاشورا جب شمر نے امام علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی تو مسلم ابن عوسجہ ہی تھے جنہوں نے اس کا دندان شکن جواب دیا۔

جنگ شروع ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ جناب مسلم پیچھے رہ جاتے۔ اگر چہ سن کے اعتبار سے مسلم بوڑھے لیکن جرأت و شجاعت کے اعتبار سے جوان تھے۔ بالآخر شہادت میں سب پر سبقت لے گئے۔ اصحاب امامؑ میں درجہ شہادت پر فائز ہونے والے سب سے پہلے شخص آپ ہیں۔

اس کے بعد انفرادی جنگ میں عبداللہ ابن عمیر، حرا بن یزید ریحی، نافع بن ہلال جملی میدان میں تشریف لائے۔ نافع نے اس طرح رجز خوانی شروع کی ”میں قبیلہ بنی جمل کا چشم و چراغ ہوں۔ میں پیرو علیؑ ہوں“ اس کے بعد آپ نے مبارز طلبی کی تو یزیدی لشکر سے مزاحم ابن حریث آپ سے مقابلہ کے لئے نکلا لیکن نافع نے اسے قتل کر دیا۔

پے در پے شکست نے لشکر یزید کے سرداروں کو چوکنا کر دیا۔ عمرو بن حجاج نے جو اس سے پہلے بھی اجتماعی حملہ کے لئے حکم دے چکا تھا، اپنے لشکر سے مخاطب ہو کر کہا: ”اب کوئی بھی انفرادی جنگ کے لئے نہ نکلے۔ جو تمہارے مقابل میں جنگ کر رہے ہیں وہ عرب کے چنے ہوئے مرد میدان ہیں۔ ان سے کوئی بھی تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن اگر اجتماعی حملہ کر دیا جائے تو جلد ہی ان کو ختم کیا جاسکتا ہے۔“ عمر سعد نے بھی اس کی موافقت کی اور ان کو دوبارہ لٹکارتے ہوئے کہا ”آگاہ ہو جاؤ، اے اہل کوفہ! اپنے رہبر (یزید) کی اطاعت میں کوتاہی نہ کرو۔ جس نے تمہارے رہبر کے خلاف بغاوت کی ہے جو دین سے پھر گیا ہے۔ اس سے جنگ کرو۔“ جب امامؑ نے عمرو کی

بے ہودہ باتوں کو سنا تو آپ نے جواب دیا:

”اے عمرو ابن حجاج! تو لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ کیا ہم دین سے پھر گئے ہیں اور دین تیرے پاس ہے؟ خدا کی قسم جلد ہی موت کا وقت آنے والا ہے تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ کون دین سے خارج ہو گیا ہے۔ جو دین سے خارج ہو گیا ہے وہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔“

عمرو نے اپنے بنائے ہوئے نقشہ جنگ کے مطابق میمنہ لشکر یزید سے امامؑ کے لشکر پر حملہ کر دیا، لیکن حسینی جانباڑوں نے ان کا سخت مقابلہ کیا اور دشمن کو پیچھے ہٹا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر جب گرد و غبار صاف ہوا تو اصحاب حسینؑ نے شدید رنج و غم کے عالم میں دیکھا کہ مسلم بن عوسجہ خاک و خون میں غلٹا ہیں۔ ابن عوسجہ اس معرکہ میں شہید ہوئے اور اس طرح عاشورا کا خونى واقعہ شروع ہوا۔

ابن عوسجہ زمین پر گر کر آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔ امامؑ مسلم کے سرہانے تشریف لائے اور اس بوڑھے مجاہد کے لئے آپ نے دعا کی اور آیت {منہم من قضیٰ نحبه و منہم من ينتظر و ما بدلوا تبديلا} کی تلاوت فرمائی۔

اس کے بعد مسلم کے پرانے دوست جناب حبیب ابن مظاہر آگے بڑھے اور انہوں نے مسلم کو مبارک باد پیش کی۔ مسلم نے مسکرا کر ان کی مبارکباد کا جواب دیا۔ حبیب نے مسلم سے وصیت کرنے کی خواہش کی۔ مسلم نے اشاروں سے کہا: ”بس میری وصیت یہ ہے کہ اپنی جان کو حسینؑ پر فدا کر دینا حبیب مولا کی نصرت و مدد میں کوتاہی نہ ہو۔“

لشکر یزید کو جو حسینی سپاہیوں کی زبردست جنگ کی وجہ سے بھاگ گیا تھا نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوا۔ لیکن جب مسلم کی کنیز نے ”اے میرے آقا“ کی آواز بلند کی تو متوجہ ہو گیا کہ مسلم ابن عوسجہ شہید ہو گئے۔ یزیدی لشکر میں خوشی کے شادیاں بجنے لگے اس منظر کو دیکھ کر لشکر یزید کا ایک سپاہی شیث ابن ربیع پھر گیا۔ اس نے کہا: ”کتنی بری بات ہے کہ تم عرب کے ایک بہادر کی موت پر خوشی منا رہے ہو۔ خدا کی قسم میں نے ابن عوسجہ کی بہادری کو آذربائجان کی جنگ میں اپنی آنکھوں

نام آیا ہے۔ صاحب ”ناسخ التواریخ“ نے بھی ان کا نام سعد لکھا ہے۔ یہ عمرو کے ساتھ شہید ہوئے۔

۵ مجمع ابن عبد اللہ

آپ اصحاب امیر المومنین میں سے تھے۔ عمرو ابن خالد کے ساتھ خدمت امام میں پہنچے اور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۶ عائد (عائذ) بن مجمع

مجمع بن عبد اللہ کے فرزند تھے اور اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے۔

۷ جنادہ ابن حارث سلمانی

اہل کوفہ میں سے تھے۔ شیخ طوسیؒ نے ”الرجال“ میں آپ کو اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے لیکن سماوی نے ”البصار العین“ میں لکھا ہے کہ جنادہ حضرت علیؑ کے ساتھ صفین میں شریک ہوئے اور کوفہ کے مشاہیر شیعہ میں سے تھے۔

۸ جندب ابن حجر کنذی خولانی

کوفہ کے رہنے والے اور مشہور شیعوں میں تھے۔ جنگ صفین میں امیر المومنینؑ کے ساتھ شریک ہوئے۔ ”ناسخ التواریخ“ اور زیارت شہداء میں آپ کا نام شہداء کے درمیان آیا ہے۔ صاحب ”حدائق الوردید“ نے لکھا ہے کہ جناب جندب کے صاحبزادہ بھی شہید ہوئے، مگر یہ ثابت نہیں ہے۔

ان افراد کی شہادت کے بعد حملہ اولیٰ شروع ہوا جس میں انفرادی اور اجتماعی جنگ ہوئی۔ معتبر تاریخوں کے مطابق اس جنگ میں پچاس انصار حسینؑ شہید ہو گئے۔

۹ ادہم ابن امیہ عبدی بصری

قبیلہ عبد قیس اور اہل کوفہ میں سے تھے۔

۱۰ امیہ ابن سعد ابن زید طائی

عرب کے مشہور بہادر تھے، ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جنگ صفین میں شرکت کی تھی۔ آٹھویں محرم کو امامؑ کی خدمت میں کر بلا پہنچے۔

۱۱ جابر ابن جراح

عامر ابن نہشل تیبی کے آزاد کردہ غلام اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ عمر سعد کے لشکر کے ساتھ کر بلا پہنچے اور مخفی طور پر امام حسینؑ سے آکر مل گئے۔

۱۲ جبلة بن علی شیبانی

اہل کوفہ میں سے تھے شجاعت میں بہت مشہور تھے۔ آپ نے بھی جنگ صفین میں شرکت کی تھی۔

۱۳ جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی

مکہ ہی سے امام کے ساتھ تھے۔ زیارت شہداء جو ابن طاووس نے نقل کی ہے۔ اس میں جنادہ کا نام نہیں ہے لیکن مامغانی نے ”تنقیح المقال“ میں جو زیارت نقل کی ہے اس میں جنادہ کا بھی نام ہے۔

۱۴ جو بن (جوین) ابن مالک ابن قیس بن ثعلبہ تیبی

قبیلہ تیم کے ساتھ رہتے تھے اور کوفہ سے عمر بن سعد کے لشکر کے ساتھ کر بلا پہنچے۔ جب آپ نے دیکھا کہ صلح کی کوئی امید نہیں ہے اور جنگ یقینی ہے تو آپ قبیلہ بنی تیم کے کچھ افراد کے ساتھ حسینؑ کی طرف چلے آئے اور پاسداران حق میں شامل ہو گئے۔ مولف ”ناسخ التواریخ“ نے آپ کا نام جو بن ابن مالک بتایا ہے لیکن انہوں نے جون، غلام ابو ذر اور جو بن ابن مالک کے نام میں غلطی سے ایک کر دیا۔

۱۵ حارث ابن امراء القیس ابن عابس کندی

آپ زہد و تقویٰ اور شجاعت و دلیری میں مشہور تھے۔ جنگوں میں شرکت کر چکے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قلعہ ”مبیر“ کا محاصرہ کیا تھا جب مرتدین مارے جانے لگے تو آپ نے اپنے چچا پر حملہ کیا اس نے کہا: ”میں تمہارا چچا ہوں۔“ حارث نے جواب دیا: ”میں جس کے لئے لڑ رہا ہوں وہ میرا خدا ہے۔“ کربلا میں بھی حارث عمر سعد کے لشکر کے ساتھ آئے اور اس کے بعد پھر امام کی طرف آگئے۔

۱۶ حارث بن بنہان (مہمان)

حزہ بن عبدالمطلب کے غلام کے فرزند تھے۔ حارث نے حضرت علی، امام حسن اور ان کے بعد امام حسینؑ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ مدینہ سے امامؑ کے ہمراہ تھے۔

۱۷ حباب ابن حارث

ابن شہر آشوب نے ان کے نام کو حملہ اولیٰ کے شہداء کی فہرست میں درج کیا ہے۔

۱۸ حباب ابن عامر ابن کعب تیمی

یہ اہل کوفہ اور شیعوں میں سے تھے۔

۱۹ حبشہ بن قیس النہی

حبشہ کے دادا پیغمبر کے صحابی تھے۔ ”ابصار العین“ میں آپ کا نام حبش ابن قیس لکھا ہے۔ شاید غلطی سے ایسا ہو گیا ہو۔

۲۰ حجاج ابن زید سعدی تمیمی

بصرہ کے رہنے والے تھے۔ جب امام حسینؑ مکہ سے سفر کرنے والے تھے تو آپ نے چند خطوط و ساء بصرہ کے نام لکھے تھے۔ اس خط کی وجہ سے حجاج امامؑ کی خدمت میں پہنچے۔

۲۱ حلاس بن عمرو ازدی راسبی

امیر المومنینؑ کے صحابی اور حضرت کی ظاہری خلافت کے زمانے میں محافظین شہر کے افسر اعلیٰ (پولیس کے چیف) تھے۔ آپ بھی کربلا میں عمر سعد کے لشکر کے ساتھ آئے اور اس کے بعد امام حسینؑ سے مل گئے۔

۲۲ حنظلہ ابن عمر (عمرو) شیبانی

ابن شہر آشوب نے حملہ اولیٰ کے شہداء میں ان کا نام ذکر کیا ہے۔

۲۳ زاہر بن عمرو سلمیٰ کندی

صحابی رسول اور راوی احادیث ہیں۔ بیعت رضوان، صلح حدیبیہ اور جنگ خیبر میں موجود تھے۔ ۶۰ھ میں حج کے لئے گئے ہوئے تھے کہ مکہ میں امام حسینؑ سے ملاقات کے بعد امامؑ کے ہمراہ ہو گئے۔

۲۴ زہیر ابن بشر خمعی

زیارت شہداء میں ان کا نام درج ہے۔ ابن شہر آشوب نے بھی ان کا نام لکھا ہے۔

۲۵ زہیر ابن سلیم ابن عمرو ازدی

یہ عمر سعد کے ان سپاہیوں میں سے تھے جو امام سے آکر مل گئے۔

۲۶ سالم غلام عامر ابن مسلم العبیدی

یہ عامر کے غلام تھے۔ عامر کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے۔

۲۷ سلیم

امام حسنؑ کے باوفا غلام تھے اور کربلا میں آپ نے حسینؑ کے قدموں پر جان دے دی۔

۲۸ سوار ابن ابی عمیر نہی

شیخ طوسیؒ کے کتاب ”الرجال“ میں ان کو اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے اور شیخ طوسیؒ نے ”من لا یحضرہ الفقیہ“ میں باب ”میراث الجنین“ میں ان سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ یہ کربلا میں امام کی خدمت میں پہنچے۔

۲۹ سیف ابن مالک عبدی

اہل بصرہ اور شیعہ تھے۔

۳۰ شعیب ابن عبد اللہ

حارث ابن سربیع ہمدانی کے غلام اور پیغمبرؐ اور علیؑ کے صحابی تھے، کوفہ میں رہتے تھے۔

۳۱ شیب (شعیب) ابن عبد اللہ ہشلی

یہ تابعین اور اصحاب علیؑ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مدینہ ہی سے امامؑ کے ہمراہ تھے۔

۳۲ ضرغامہ ابن مالک تغلبی

شیخ طوسیؒ نے رجال میں ان کو اصحاب حسینؑ میں شمار کیا ہے۔ یہ بھی کوفہ کے رہنے والے تھے۔

۳۳ عامر ابن مسلم عبدی بصری

آپ بصرہ کے رہنے والے تھے۔

۳۴ عباد ابن مہاجر ابن ابی المہاجر جہنی

ان بادیہ نشین (بدو) عربوں میں سے تھے جو راستے میں امام سے آکر مل گئے تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت خطرے کو محسوس کر کے متفرق ہو گئی۔

۳۵ عبد الرحمن ابن عبد رب انصاری خزرجی

۳۶ عبد الرحمن ابن عبد اللہ بن کدن ارجبی

آپ تابعی ہیں۔ وہ گروہ جو کوفہ سے امامؑ کو بلانے کے لئے مدینہ آیا تھا، اس میں آپ بھی تھے۔

۳۷ عبد الرحمن ابن مسعود

لشکر عمر سعدؓ میں تھے مگر ساتویں محرم سے ملحق ہو گئے۔

۳۸ عبد اللہ ابن بشر خمعی

اپنے زمانہ کے بڑے مشہور بہادر تھے۔ آپ نے قادسیہ کی جنگ میں شرکت کی تھی اور آپ بھی عمر سعدؓ کے شکر میں تھے لیکن پھر امامؑ سے آکر مل گئے۔

۳۹ عبد اللہ ابن یزید ابن شعیب (شعیب) قیسی

بصرہ سے نصرت امام حسینؑ کے لئے تشریف لائے۔

۴۰ عبید اللہ ابن یزید ابن شعیب (شعیب) قیسی

آپ عبد اللہ کے بھائی تھے۔

۴۱ عقبہ ابن صلت جہنی

آپ ان بدو عربوں میں شامل تھے جو راستے میں امام کے ساتھ ہو گئے۔ مامغانی نے آپ کو ان اصحاب رسولؐ میں شمار کرتے ہیں جو مدینہ ہی سے امام کے ساتھ تھے۔

۴۲ عمار ابن ابی سلامہ دالالی (دالانی)

ابن حجر کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صحابی پیغمبرؐ علیؑ تھے۔ آپ نے جمل و صفین و نہروان میں بھی شرکت کی تھی۔ ابن شہر آشوب نے مقتولین حملہ اولیٰ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

۴۳ عمار ابن حسان طائی

آپ کے والد حسان ابن شریح اصحاب علیؑ میں سے تھے اور جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ زیارت شہداء میں عمار پر بھی سلام بھیجا گیا ہے۔

۴۴ عمرو ابن ضبیعہ بن قیس ابن ثعلبہ تیمی

لشکر ابن سعد کے ساتھ آئے اور پھر امامؑ سے ملحق ہو گئے۔

۴۵ عمران ابن کعب ابن حارث اشجعی

مناقب ابن شہر آشوب میں اور زیارت شہداء میں آپ کا نام موجود ہے۔ صاحب ”ناخ التوارخ“ نے آپ کا نام عمران کعب بتایا ہے۔

۴۶ قارب غلام حسینؑ

آپ کی ماں جناب رباب (مادر جناب سکینہ) کی کنیز تھیں۔ آپ مدینہ ہی سے امام کے ساتھ تھے۔

۴۷ قاسط ابن زہیر ابن حارث تغلبی

امیر المومنینؑ کے صحابی تھے اور کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔

۴۸ قاسم ابن حبیب ابن ابی بشر ازدی

شعیبان کوفہ میں سے تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کو اصحاب امام حسینؑ میں شمار کیا ہے۔

۴۹ کردوس ابن زہیر ابن حارث تغلبی

یہ قاسط ابن زہیر کے بھائی اور امیر المومنینؑ کے صحابی تھے۔

۵۰ کنانہ ابن عتیق تغلبی

حافظ قرآن، عابد و زاہد اور بڑے شجاع تھے۔

۵۱ مجمع ابن زیاد ابن عمرو جہنی

آپ بھی انہیں بدو عربوں میں سے تھے جو راستہ میں امام حسینؑ سے آکر مل گئے تھے۔

۵۲ مسعود ابن حجاج تیمی

کوفہ کے رہنے والے اور نمایاں شیعہ تھے۔ عمر سعد کے ساتھ آئے لیکن ساتویں محرم کو امام سے آکر مل گئے۔

۵۳ مسلم بن کثیر اعرج

شیخ طوسیؒ نے رجال میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ انہیں اعرج اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے پیر میں لنگ تھا۔ حضرت علیؑ کے ساتھ جنگ میں شریک ہو کر زخمی ہوئے اور کوفہ میں ساکن تھے۔

۵۴ مقسط ابن زہیر ابن حارث تغلبی

آپ بھی اپنے دونوں بھائیوں کی طرح صحابی علیؑ تھے۔ شیخ طوسیؒ نے آپ کا تذکرہ فرمایا ہے لیکن زیارت شہداء میں صرف آپ کے دونوں بھائیوں کا ذکر ہے۔

۵۵ منیع بن زیاد

مامغانی نے زیارت ”رجبہ“ سے نقل کرتے ہوئے ان کو شہداء عاشوراء میں شمار کیا ہے۔

۵۶ نصر ابن ابی نزر

کہا جاتا ہے کہ ان کے والد نجاشی بادشاہ کے خاندان سے تھے جو بچپن میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پیغمبرؐ اور علیؑ کی خدمت میں رہے۔ نصر کے والد بھی حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ نصر مدینہ ہی سے امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔

۵۷ نعمان بن عمرو ازدی راہبی

کوفہ کے رہنے والے تھے۔ صفین میں شرکت فرمائی اور اپنے بھائی کی طرح عمر سعد کے ساتھ کر بلا آئے، اس کے بعد امام سے مل گئے۔

۵۸ نعیم ابن عجلان انصاری

حضرت علیؑ کے زمانے میں بحرین کے والی نعمان کے فرزند تھے۔ کوفہ سے امام کی خدمت میں پہنچے۔

یہ وہ شہداء تھے جو حملہ اولیٰ میں شہید ہو گئے اور اب ان شہداء کے نام درج کر رہا ہوں جو حملہ اولیٰ کے بعد نماز ظہر تک شہید ہوئے۔

۵۹ بکر بن جی بن تیم بن ثعلبہ تیمی

عمر سعد کے لشکر میں تھے اور بعد میں امام سے مل گئے۔

۶۰ عمر ابن جنادہ بن کعب خزرجی

ان کے والد جنادہ ابن کعب حملہ اولیٰ کے شہداء میں سے ہیں۔ عمرو ابن جنادہ کی عمر صرف دس سال کی تھی یہ کمسن نوجوان امام کی خدمت میں تشریف لایا تاکہ اذن جہاد طلب فرمائیں۔ امام نے فرمایا: ”تم نوجوان ہو۔ تمہاری موت تمہاری ماں کے لئے بہت سخت ہوگی، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے شوہر سے محروم ہو چکی ہیں۔“ عمر نے کہا: ”لیکن اس لباس جنگ کو خود میری ماں نے پہنایا ہے۔“ یزید یوں نے عمرو کے سر کو کاٹ کر ان کی ماں کی طرف پھینک دیا لیکن اس شیر دل خاتون نے سر کو چوم کر دوبارہ میدان میں ڈال دیا اور کہا: ”ہم جس چیز کو خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں اسے واپس نہیں لیتے!!!“ اس کے بعد خود بھی لشکر یزید پر جھپٹیں مگر امام نے مادر عمر کو واپس خیمہ میں پلٹا دیا۔

۶۱ یزید ابن حصین مشرقی

کوفہ کے رہنے والے تھے۔ شیخ الطائفہ نے ان کو بھی اصحاب حسینؑ میں شمار کیا ہے۔

زیارت شہداء میں ان پر بھی سلام ہے اور صاحب ”ناخ التواریخ“ نے بھی ان کا ذکر شہداء کر بلا میں کیا ہے۔

۶۲ حبیب ابن مظاہر اسدی

عرب کے مشہور شاعر ربیعہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ابن کلبی حبیب کو صحابی رسولؐ اور شیخ طوسیؑ ان کو صحابی علیؑ و حسنؑ و حسینؑ سمجھتے ہیں۔ حبیب حضرت علیؑ کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ حضرت علیؑ کے رموز باطنی سے آگاہ تھے۔ حبیب حسینؑ کے بچنے کے دوستوں میں سے تھے۔ آپ کو حسینؑ کے اصحاب کے درمیان مخصوص بلندی حاصل ہے۔ کوفہ سے جو دعوت نامہ آیا تھا اس میں حبیب کا نام بھی نظر آتا ہے۔ نویں محرم کی رات حبیب نے فوج یزیدی کو نصیحت کی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ صبح عاشوراء امامؑ کی شان میں شرکی جسارت کا دندان شکن جواب دیا۔ روز عاشوراء امام نے حبیب کو اپنے مختصر سے لشکر کے میسرہ کی سرداری عطا کی۔ نماز ظہر کے وقت ابن عقیم نے امام کی شان میں جسارت کی۔ حبیب غضبناک ہو کر حملہ آور ہوئے اور دشمن حبیب پر ٹوٹ پڑے اور اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔

۶۳ حرا بن یزید ریاحی

حرا بن یزید ابن ناحیہ ابن قصب (قعب) ابن عتاب ابن ہرمی ابن ریاح ابن یربوع ابن حنظلہ ابن مالک ابن زید ابن الخثیم لثیمی۔ عرب کے ایک محترم اور مشہور خانوادہ سے تھے۔ حر کے دادا، عتاب بادشاہ حیرہ نعمان ابن منذر کے مشیر اور بہت ہی قریبی تھے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ ان کا اتنا احترام کرتا تھا کہ صرف انہیں کا گھوڑا بادشاہ کے گھوڑے کے برابر میں چل سکتا تھا اور بقیہ دوسرے امراء، بادشاہ کے پیچھے چلتے تھے۔ عتاب کے دو فرزند تھے: قیس اور قصب، عتاب کے مرنے کے بعد قیس باپ کے جانشین ہوئے۔ بنی شیبان ان سے جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ نتیجہ میں مشہور جنگ ”یوم الطحفہ“ واقع ہوئی۔ قیس ہی کے خاندان سے احوں شاعر تھے جو اصحاب پیغمبرؐ

میں شمار کئے جاتے ہیں۔ احوص قیس کے والد کے چچا زاد بھائی تھے۔

خود جناب حرکا شمار کوفہ کے اشراف اور رہبروں میں تھا۔ فوج ابن زیاد کے ایک بڑے کمانڈر تھے۔ حر لشکر قادسیہ میں جو حصین کی سرکردگی میں امام کے محاصرہ کے لئے بھیجا گیا تھا، موجود تھے۔ اس کے بعد کوفہ میں وارد ہونے سے روکنے کے لئے جو ایک ہزار کا لشکر بھیجا گیا تھا۔ حراس کے سردار تھے۔ اس کے نتیجے میں امام کو کربلا میں اترنا پڑا۔ امام کے ساتھ حرکا پہلا سلوک ایک دشمن کا سلوک تھا، لیکن لشکر حر کو جب امام نے پانی سے سیراب کیا تو امام کا یہ انسانی سلوک اور معنوی کشش حر کی روح کی گہرائیوں پر اثر انداز ہوئی۔ جب حر کا لشکر امام کے قافلہ سے ملا تو پورا لشکر جاں بلب تھا۔ امام نے وہ سارا پانی جو آپ کے پاس تھا، دشمن کو پلا دیا۔ اس سلوک نے حر کے اوپر شدید نفسیاتی اثر ڈالا۔ لیکن روز عاشورا تک حر یزید کے لشکر میں تھے۔ صبح عاشوراء آپ نے اپنا راستہ منتخب کر لیا اور امام کی طرف چلے آئے۔

جنگ شروع ہونے کے بعد جب یزیدی لشکر کے دو سپاہی عبداللہ ابن عمیر کے ہاتھوں مارے گئے تو عمر و ابن حجاج جو ابن زیاد کے مہم کے لشکر میں تھا بہت پریشان ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اجتماعی طور پر حصین کی فوج پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن حصین کے اصحاب نے بڑی بہادری سے جنگ کی اور دشمن کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ دشمن کا بڑا نقصان ہوا۔ حر جو اس تمنا میں تھے کہ سب سے پہلے اپنی جان راہ اسلام میں قربان کر دیں، جب اس منظر کو دیکھا تو اور بھی ہوشیار ہو گئے کہ کہیں انصار حصین میں سے کوئی دوسرا سبقت نہ لے جائے۔ آپ امام کی خدمت میں تشریف لائے اور عرض کی: ”اے میرے آقا! میں پہلا شخص تھا جو آپ کے مقابل آیا اور اب میری تمنا یہ ہے کہ سب سے پہلے میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔“ امام نے حر کو اجازت دے دی۔ حر دلیرانہ شعر پڑھتے ہوئے تشریف لائے: ”میں حر ہوں۔ کافروں پر اپنی تلوار سے ایسا وار کروں گا جو تاریخ میں بھلانے کے قابل نہ ہو۔ سرزمین مکہ کے بزرگ ترین انسان کی رہبری میں، میں دشمنوں کو تہ تیغ کروں گا۔“ پھر اس کے بعد آپ نے حملہ کر دیا۔

صبح عاشورا جب یہ بات لشکر یزید میں پھیل گئی کہ حر امام کے لشکر سے جا کر مل گئے تو ایک کوئی سپاہی جس کا نام یزید ابن سفیان تھی تھا، کہتا ہے:

”خدا کی قسم اگر میں اس وقت متوجہ ہو گیا ہوتا تو نیزہ کے ایک ہی وار سے حر کا کام تمام کر دیتا۔“ اب حر تنہا یزید کے لشکر سے لڑنے جا رہے تھے، تلواروں کے وار کر رہے تھے اور آگے بڑھتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے: ”ما ذلت ارمیہم ثغرہ نحرہ ولبانہ حتی تسربل بالدم“ ”میں گھوڑے کی گردن اور سینہ کو دشمن کی فوج میں ڈال دوں گا یہاں تک کہ میرا ر ہوا ر خون کی چادر اوڑھ لے۔“ یہ شعر مکمل طور پر ان کے حالات کی تصویر کشی کر رہا ہے اس لئے کہ حر کا گھوڑا شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس وقت حصین ابن تیم نے جو سپاہ قادسیہ کا سردار تھا جس میں پہلے حر بھی رہ چکے تھے، یزید ابن سفیان سے کہا: ”تجھے یہ تمنا تھی کہ حر کو قتل کرے گا۔ اب آگے کیوں نہیں بڑھتا۔“ یزید ابن سفیان کے دل میں شیطانی خیال آیا اور حر کے مقابل آکر مبارز طلبی کرنے لگا لیکن حر نے اتنی جلدی اس کا کام تمام کیا کہ طبری کے مطابق جو خود حصین سے نقل کرتا ہے، حصین نے کہا: ایسا لگا کہ یزید کی جان حر کی ہتھیلی پر تھی۔“ اس واقعہ کے بعد ابن زیاد کے سپاہیوں میں سے کسی نے تنہا حر سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔ حر بھی جن کا گھوڑا شدید زخمی ہو گیا تھا امام کے لشکر میں واپس آ گئے۔ اس کے بعد اس ”جنگ مغلوبہ“ میں شرکت کی۔ پہلے ہی حملہ میں حر کا ر ہوا ر گر پڑا۔ اور حر پیادہ ہو گئے حبیب ابن مظاہر کی شہادت جس نے امام کو بہت متاثر کیا تھا اس کے بعد حر نے ارادہ کیا کہ منزل شہادت تک پہنچنے میں دیر نہیں کروں گا۔ امام سے اجازت مانگی اور میدان جنگ میں آکر زبان پر کچھ اشعار جاری کئے جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”خدا کی قسم جب تک دشمنوں کو واصل جہنم نہ کر لوں گا قتل نہیں ہوں گا۔ میں صرف اسی حال میں زمین پر گروں گا جب آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ آج ایسی شمشیر زنی کروں گا جو تاریخ میں یادگار بن جائے۔ نہ میں فرار کروں گا

اور نہ کوتاہی سے کام لوں گا۔“

کبھی فرماتے تھے:

”میں ان کی محبت میں تلوار چلا رہا ہوں جنہوں نے

سرزمین حرم کو آبرو بخشی“

معلوم نہیں کہ امام کے حکم سے یا اپنے صواب دید کی بنا پر زہیر قین بھی حر کے ساتھ مشغول جنگ تھے۔ ان دونوں مجاہدوں میں سے جب کوئی ایک مجاہد گھر جاتا تھا تو دوسرا مجاہد اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتا تھا۔ بڑی دیر تک یہی صورت حال رہی۔ اس کے بعد دشمن کے لشکر نے ہر جانب سے حر پر حملہ کر دیا اور جناب زہیر ان کی مدد نہ کر سکے۔ آخر میں ایوب ابن مسرح کے ہاتھوں اس بزرگ اور دلیر سردار کی شہادت ہوئی۔

جب حر کے خون آلود جسم کو امامؑ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اپنے سپاہی کی اس طرح عزت و جلالت دی کہ حر کے پہلو میں بیٹھ گئے، خاک و خون کو ان کے جسم سے صاف کیا اور فرمایا ”میں گواہی دیتا ہوں تم دنیا و آخرت دونوں میں حر (آزاد) ہو۔“

امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی آزادی اس کے رفتار و عمل سے جھلکتی رہے۔ وہ شخص جو ہوائے نفس کے جال میں گرفتار ہو، کسی بھی صورت میں آزاد نہیں ہے۔

حر کا دلیرانہ انتخاب

حر کی زندگی کے بارے میں جو گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں حر ظلمت کے گہرائیوں اور تباہی کے بھنور میں پھنسے ہوئے انسان تھے۔ اس کے بعد نورانی ذرہ کی طرح آفتاب کی طرف پرواز کیا۔ حر مامور ظلم تھے اور جنگ حق و باطل کے درمیان کشمکش میں تھے، بلکہ باطل کی طرف تھے۔ آپ نے آخری گھڑیوں اور آخری فرصت میں انتخاب کیا۔ ایک بڑا انتخاب، ایسا انتخاب جو انسانی وجود کی سب سے اعلیٰ تجلی ہے۔ ظلمت کا سینہ چاک

کر کے نور کی سمت پرواز کر گئے۔ یہ انتخاب کوئی معمولی انتخاب نہ تھا بلکہ حق و باطل اور کفر و ایمان کے درمیان انتخاب تھا، وہ بھی جان کی قیمت پر۔ حر نے جو انتخاب فرمایا وہ یقیناً تاریخ کا بہت بڑا انتخاب ہے اور یہ سچ ہے کہ حر اسم با مسمیٰ تھے۔ انہوں نے اپنے آزاد ہونے کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا اور تاریخ انسانیت میں غلامی، سیاست اور نفسانیت کی زنجیروں سے آزادی کا نمونہ بن گئے۔ اسی وجہ سے شہادت کے بعد جب امامؑ حر کے سر ہانے پہنچے تو آپ نے حر کے حر ہونے کو سراہتے ہوئے فرمایا: ”اے حر تجھے مبارک ہو تیری ماں نے تیرا نام حر رکھا تو دنیا میں بھی حر ہے اور آخرت میں بھی حر ہے۔“

حر نے جب سے امامؑ کو دیکھا تھا ان کی روحانی جذب و کشش سے متاثر تھے ان کی حقانیت کا یقین کر چکے تھے لیکن شروع میں انتخاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ صلح و صفائی سے کام چل جائے۔ اپنے کام کی حفاظت بھی ہو جائے اور حر ہونے کی لاج بھی رہ جائے یعنی انسانی وجود کی اصلیت کی لاج۔۔۔۔۔ لیکن حالات نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور حر کا اضطراب بڑھا اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اپنے وجود حریت اور جاہ و منصب میں سے کسی ایک کا انتخاب لازمی تھا۔

عمر سعد سے حر کی گفتگو نفس کی اس اندرونی کش مکش کا نمونہ ہے۔ یہ گفتگو حر کے اضطراب اور درد و کرب کو نمایاں طور پر پیش کرتی ہے۔ کربلا کی جنگ شروع ہونے سے پہلے حر کے نفس میں ایک کربلا پاتھی۔ جب نفس ایک طرف چاہتا تھا کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہنے دے، دوسری طرف نام کا تقاضا یہ تھا کہ ان زنجیروں کو توڑ کر اپنے اصلی وجود کو حاصل کر لیا جائے۔ حریت کا وہ وجود جو ابھی تک صرف نام کی حدوں میں تھا، اسے حقیقت کی شکل دینا چاہتے تھے۔

جناب حر عمر سعد سے پوچھتے ہیں: ”کیا اس قضیہ کو صلح کے ذریعہ ختم نہیں کر سکتے۔“ عمر سعد جواب دیتا ہے: ”اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا لیکن تیرا امیر عبید اللہ ابن زیاد جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔“ حر نے درد و کرب و اضطراب سے بھرے لہجے میں پوچھا: ”تو اس کا مطلب

یہ ہے کہ تم حسینؑ سے جنگ کرو گے!“ عمر سعد نے جواب دیا: ”بخدا ایسی جنگ کروں گا کہ سڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔“

حرنے اپنی زندگی کا سب سے آخری انتخاب کیا۔ اب حرمیں ننگ و عار کی تاب نہ تھی۔ وہ ابن سعد جیسوں کے مانند نہ تھے جو ننگ و عار کو جھیلنے رہتے ہیں وہ تو دوسرے میدان کے شہسوار تھے، وہ حر (آزاد) تھے۔ حرنے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے وجود کو پالیا اور ایک ہی جست میں ظلمت سے نور کی طرف آگئے۔ چند لمحوں میں انہوں نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا، شیطان سے خدا تک کا فاصلہ!! اور اب جناب حر آزاد تھے۔ آفریں صد آفریں کہ آپ دنیا میں بھی آزاد تھے اور آخرت میں آزاد ہو گئے۔

۶۲ سعید ابن عبد اللہ حنفی

کوفہ کے محترم شیعوں میں سے تھے اور عبادت و شجاعت میں مشہور زمانہ تھے۔ شیعیان کوفہ کے نمائندہ کی حیثیت سے امام کو بلانے کے لئے مدینہ تشریف لے گئے۔ کوفہ میں مسلم کے مددگار تھے۔ جب وقت ظہر امام نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو سعید امام کے آگے کھڑے ہو گئے تاکہ دشمنوں کے آنے والے تیروں کے لئے سپر بن جائیں اور پھر شہید ہو گئے۔

۶۵ زہیر ابن قین ابن قیس الجلی

شرفائے عرب اور اہل کوفہ میں سے تھے۔ بڑے بہادر اور جنگجو تھے۔ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے زمانہ میں زہیر عثمانی تھے اور شیعوں سے ان کا رابطہ نہ تھا۔ لیکن ۶۰ھ میں جب حج کے مقصد سے مکہ گئے تو ان میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ صبح عاشور امامؑ نے آپ کو میمنہ لشکر کا سردار بنادیا۔ عاشور کے دن زہیر نے اپنی شہادت سے بہادری کے وہ انمٹ نشان چھوڑے جسے تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ نماز ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

۶۶ سلمان بن مضارب بن قیس الجلی

زہیر کے چچا زاد بھائی تھے اور آپ بھی زمانہ حج ہی سے امامؑ کے ساتھ ہو گئے تھے۔

۶۷ عمرو ابن قرظہ بن کعب الانصاری

آپ کے والد قرظہ صحابی پیغمبر تھے۔ صاحب ”ناسخ التواریخ“ نے ان کا نام عمرو ابن قرظہ لکھا ہے جو بہت بڑی غلطی ہے۔

۶۸ نافع بن ہلال جلی

نافع نے عاشور کے دن بڑی بہادری کا مظاہرہ فرمایا۔ آپ بڑے ماہر شمشیر زن تھے۔ یزیدیوں کے بارہ افراد کو قتل کیا۔ اس کے بعد آپ شمر کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

۶۹ بریر ابن خضیر ہمدانی

عابد و زاہد اور حافظ قرآن تھے۔ حضرت علیؑ کے صحابی کوفہ کے رہنے والے اور ہمدانی قبیلہ کے شرفاء میں سے تھے۔

۷۰ ابو ثمامہ صاندی

شیخ طوسیؒ نے ”رجال“ میں ابو ثمامہ کو اصحاب حسینؑ میں شمار کیا ہے۔ آپ بزرگ شیعوں میں سے اور بڑے مشہور بہادر تھے۔ کوفہ میں جناب مسلم ابن عقیل کے مددگار تھے۔

۷۱ جون غلام ابوذر غفاری

جون کا رنگ سیاہ تھا آپ افریقی تھے اور فضل ابن عباس ابن عبد المطلب کے غلام تھے۔ حضرت علیؑ نے آپ کو خرید کر ابوذر کو ہدیہ کر دیا تھا۔ ربذہ میں جناب ابوذر کے ساتھ تھے۔ ابوذر کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ کی خدمت میں پھر امام حسنؑ کی خدمت میں اور اس کے بعد سید الشہداء کے ساتھ رہے۔ مختلف کتابوں میں شہدائے عاشوراء کے کچھ اور نام بھی موجود ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

- ۷۲ شوزب ابن عبداللہ
- ۷۳ عابس ابن ابی شیبہ شاکری
- ۷۴ عبداللہ ابن عروہ ابن حراق غفاری
- ۷۵ عبدالرحمن ابن عروہ غفاری
- ۷۶ حنظلہ ابن اسعد شامی
- ۷۷ سیف ابن حارث ابن سربیع ابن جابر ہمدانی
- ۷۸ مالک ابن عید (عبد/عبداللہ) ابن سربیع
- ۷۹ غلام ترکی
- ۸۰ حجاج ابن مسروق جعفی
- ۸۱ زیاد ابن عریب ہمدانی
- ۸۲ سالم ابن عمرو ابن عبداللہ غلام بن (بنی) المدینہ الکلبی
- ۸۳ سعد ابن حارث غلام امیر المومنینؓ
- ۸۴ عمر ابن جندب خضرمی (حضری)
- ۸۵ قعنب (قعنب) ابن عمرو نمری
- ۸۶ یزید ابن ثبیط عبدی
- ۸۷ یزید ابن زیاد ابن مہاصر ابو الششاء کندی

- ۸۸ یزید ابن مغفل جعفی کوفی
- ۸۹ رافع ابن عبداللہ غلام مسلم ازدی
- ۹۰ بشر ابن عمرو ابن الاحدوث الحضرمی الکندی
- ۹۱ سوید ابن عمرو ابن ابی المطاع خشمی (خشمی)

دوسرے بیس اصحاب کے نام مختلف کتابوں میں جیسے ”العباد العین“، ”مناقب ابن شہر آشوب“، ”ناسخ التواریخ“، ”اصابہ“ وغیرہ میں ذکر ہوئے ہیں۔ (اس سلسلہ میں سید العلماء مولانا علی نقوی صاحب کی کتاب شہداء کربلا ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔)

شہداء بنی ہاشم

اصحاب کی شہادت کے بعد بنی ہاشم، دودمان امامت اور وابستگان امام کی باری آئی۔ پیغمبر اکرمؐ جنگوں میں اپنے اعزہ واقارب کو دوسروں پر مقدم فرماتے تھے۔ اسی وجہ سے بنی ہاشم کے افراد جیسے حمزہ و جعفر ان جنگوں میں شہید ہوئے لیکن کربلا میں امامؑ نے پہلے اصحاب کو میدان جنگ میں بھیجا۔ اس کے بعد اعزہ کی باری آئی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ان جنگوں میں کچھ شہید ہوتے تھے، کچھ زندہ رہ جاتے تھے، لیکن عاشور کے دن صحرائے کربلا میں تیس ہزار کے لشکر کے مقابل میں تھوڑے سے افراد تھے اور یہ معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی بھی حتیٰ کہ طفل شیرخوار بھی زندہ نہیں بچے گا۔ چونکہ یہاں تین دن پہلے پانی بھی ختم ہو گیا تھا، اس لئے جو شخص پہلے شہید ہو جاتا اس کو کم اذیت پہنچتی اور جو زیادہ دیر تک زندہ رہ جاتا ہے اس کو زیادہ تکلیف ہوتی۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ حسینؑ علی اکبر سے کہتے کہ ”تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم بہشت میں جا کر سیراب ہو جاؤ اور غلام ابوذر پیاسا رہ جائے۔“ اس لئے جب تمام اصحاب شہید ہو چکے، تب بنی ہاشم کی باری آئی۔ چونکہ شہدائے بنی ہاشم کے حالات بہت مشہور ہیں اس لئے ہم یہاں صرف ان شہداء کی

۲۳ محمد بن علی

۲۴ عبداللہ ابن الحسین

۲۵ علی اصغر ابن الحسین

ابن شہر آشوب کا کہنا ہے کہ روز عاشوراء بنی ہاشم کے ستائیس (۲۷) افراد شہید ہوئے لیکن مولانا علی نقی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ بنی ہاشم میں اٹھارہ افراد کا روز عاشوراء شہید ہونا یقینی ہے اور وہ یہ ہیں:

اولاد امام حسینؑ

علی اکبر، عبداللہ الرضیع

اولاد امام حسنؑ

قاسم، ابوبکر، عبداللہ

اولاد امیر المومنینؑ

عباس، عبداللہ، عثمان، جعفر، محمد

اولاد جعفر

عون، محمد

اولاد عقیل

عبداللہ، محمد، جعفر، عبدالرحمن، محمد ابن ابی سعید ابن عقیل



زینب سلام اللہ علیہا

شہادت کی پیغامبر اور انقلاب کے تسلسل کی نشانی

شہداء خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ ۶۱ھ کے محرم کا عاشورہ ختم ہو چکا ہے۔ زینب کربلا سے آرہی ہیں اور تماشہ بینوں کے شور و غل اور جلادوں کے نرغہ میں گھری، ظلم کے پایہ تخت میں ”خون“ اور ”شہید“ کی بات کرتی ہیں، تاکہ ”عاشورا“ اور ”کربلا“ کبھی ختم نہ ہو، تاکہ ہر روز، عاشورا اور ہر سرزمین، کربلا ہو جائے۔ ۶۱ھ کے محرم کا عاشورا ختم ہو گیا مگر عاشورا ختم نہیں ہوا ہے۔ ”عاشورا“ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس تسلسل کو قائم رکھنے والی زینب ہیں۔ زینب پیغامبر شہادت ہیں جو کربلا سے آرہی ہیں تاکہ ”خون“ کے پیغام کو پہنچا دیں اور ظلم کے پایہ تخت اور ظالم کے دربار میں ”خون“ اور ”پیغام“ کی گفتگو کریں، اور بتائیں کہ اس خون آلود صحرائیں کیا واقعات پیش آئے اور وہ واقعات کیوں پیش آئے اور ان واقعات کا بانی اور پشت پناہ کون تھا اور یہ بھی بتائیں کہ جو ہستیاں اپنے خون میں غلطاں پڑی ہیں، وہ کون ہیں، ان کا خون کیوں بہا ہے اور اس خون کے پس پردہ کون سا مقدس مقصد ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حسینؑ کے انقلاب کی پیغامبر زینب ہیں اور زینب کا پیغام زمانے کی سانسوں کے ساتھ جاری ہے۔

زینب ایک ایسی خاتون ہیں جو پیغام حسینؑ کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں کہ ان کے پیچھے اسیروں کا قافلہ ہے۔ زینب تنہا ہیں، اسیری کا عالم ہے مگر ان کی شعلہ بیانی ایسے طوفان برپا کر رہی ہے جس سے ظالموں اور جلادوں کی بساط الٹ جاتی ہے۔ زینب حسینؑ کے پیغام کو علیؑ کے انداز میں پہنچا رہی ہیں۔ حسینؑ کا پیغام کیا تھا؟ ظلم اور ظالموں کو ذلیل کرنا، اسلامی بنیادوں کا تحفظ اور اسلام کو خلافت سے جدا کر دینا۔ زینب اپنے شعلہ بار خطبوں کے ذریعہ بازار کوفہ و شام اور ابن زیاد اور یزید کے دربار میں اس پیغام کو بڑی خوش اسلوبی

سے پہنچا رہی ہیں۔ حسینؑ کے پیغام کو زینب علیؑ کے لب و لہجہ میں بیان کر رہی ہیں۔ خطبات کی شعلہ فشانہ ظالموں کے سروں پر بجلیاں گرا رہی ہے۔ بشیر بن حریم اسدی کہتا ہے:

”عرب کی تاریخ میں کبھی کسی عورت نے ایسی تقریر نہیں کی اور لوگوں کو علیؑ یاد آ گئے، ایسا لگ رہا تھا جیسے خود علیؑ تقریر کر رہے ہوں۔“

زینب کا وہ مقصد اور یہ وسیلہ! کر بلا کی یہ شیر دل خاتون اپنے فریضہ کو انجام دینے میں کہاں تک کامیاب ہوئی؟ اس عظیم کامیابی کو سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ حکومت بنی امیہ اور سلطنت بنی عباس کا زبردست پروپیگنڈہ بھی خون حسینؑ کو زیر میں پوشیدہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور محشر تاریخ میں خون شہید کا ہر قطرہ مشعل بکف ظاہر ہوگا اور باطل و ظلم کی تاریکیاں اس کو چھپانہ سکیں گی۔ جناب زینب نے بھی اس خون بہادری کو زندہ رکھنے میں اساسی کردار ادا کیا۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے قابیلیوں کو کسی طرح بھی ہابیلیت کو تہہ خاک چھپانے نہ دیا۔ انھوں نے شہادت کا پیغام ساری دنیا کے کانوں تک پہنچا دیا۔ زینبؑ انقلاب کے تسلسل و بقا کی نمایاں نشانی ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ انقلابیوں کی موت کے ساتھ انقلاب ختم نہیں ہوتا بلکہ اسی سے شہیدوں کی فتح کا آغاز ہوتا ہے۔ زینب محض تسلسل انقلاب کا مظہر ہی نہیں ہیں بلکہ نظام ظلم و استبداد کو ناکام بنانے والی بھی ہیں۔ انہوں نے ظالم کو اس کی ہونے والی شکست سے مطلع کر دیا۔ اگر زینبؑ نہ ہوتیں، تو یزید خون حسینؑ کی سرخی کو کر بلا تک محدود رکھنے میں کامیاب ہو جاتا، مگر زینب نے اس خون کی سرخی کو آفاق زمانہ کی بلندیوں پر پھیلا دیا اور ظالم کو اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس خون کو چھپا سکے۔

حضرت زینب کی شجاعت

زینب کی شجاعت کا اندازہ لگانے کے لئے سب سے پہلے اس زمانے کے حالات پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس زمانے میں ظلم و جور کا ایسا راج تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بڑے

بڑے شمشیر زن، دلاور اور سورما اصحاب گوشہ عافیت میں چھپ گئے تھے اور دامن عبادت و ریاضت میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حسینؑ عظیم ترین معیار حق و باطل اور اسلامی قدروں کے علمبردار ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انھیں حسینؑ کے نقش قدم کو نمونہ بنا کر ان کی پیروی کرنا چاہئے مگر اس کے باوجود وہ ظالم کے نیزہ و شمشیر کے خوف سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ خنجر و شمشیر اور ظلم و ستم کے بوجھ تلے عوام اس قدر دبے ہوئے تھے کہ وہ بل بھی نہیں سکتے تھے۔ قساوت، خشونت اور قتل عام کے ذریعہ سب کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ اس وقت زینبؑ جو اپنے بہتر ۷۲ اعرار کی شہادت دیکھ چکی ہیں اور ان ظالموں کے بیچ میں تنہا ہیں اپنے اقدام کو اس قدر قطعی، واقف کارانہ اور نپے تلے انداز میں پیش کرتی ہیں جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

زینب علیؑ وفا طمہ کی بڑی بیٹی، انہیں کی آغوش کی پروردہ ہیں۔ امیر المومنینؑ نے جناب زینب کو اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں دے دیا۔ مختلف تاریخی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ کو جناب زینب سے خصوصی انسیت تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک حساس دور میں وہ اسلام کی علمبردار ہوں گی اور تحریک محمدی و علوی کو دوام بخشیں گی۔ امیر المومنینؑ نے حضرت زینب کو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ رکھا۔ جیسا کہ اپنی زندگی کے آخری رمضان میں انھوں نے ان ہی تین بچوں کے گھرا پنا افطار رکھا۔ مدینہ سے کر بلا تک زینب ہر مرحلہ پر حسینؑ کے ساتھ رہیں۔

جناب زینبؑ کی اہم ذمہ داری

حضرت زینب کی اصل ذمہ داری عصر عاشورا کو ”شام غریباں“ سے شروع ہوتی ہے اور کوفہ و شام اور دربار ابن زیاد و یزید میں اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ زینب کے فرائض کی دشواری قابل غور ہے۔ ایک عورت جس کے گھرانے کے بھائی، بچے اور عزیز سب اس کی آنکھوں کے سامنے بیدردی سے شہید کر دیئے گئے اور خود دشمنوں کی زنجیروں کی قید میں ہے، جس کے ساتھ

اسیروں کا قافلہ ہے، جس کی حدنگاہ تک افواجِ دشمن کی صفیں ہیں، جو دشمن کے شہر اور ظالم حاکم کے پایہ تخت میں ہے مگر حق اور حقیقت کا اعلان کر رہی ہے۔ جناب زینبؑ کس ہمت و شجاعت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتی ہیں۔ حقیقتاً زینب وہ خاتون ہیں جن سے مردوں کو بھی درس شجاعت لینا چاہئے۔

شہادت حسینؑ کے بعد جب زینب کو اپنے کاندھوں پر ذمہ داریوں کے بوجھ کا احساس ہوا تو بالکل بدل گئیں۔ تاریخی کتابیں اور مقاتل کے مطابق شہادت حسینؑ سے قبل زینب کو چند بار غش بھی آیا تھا۔ وہ اشکبار بھی ہوئی تھیں۔ ایک واقعہ کے مطابق جس کا ذکر تاریخ میں تفصیل سے ہے، جس وقت امام حسینؑ کی زبان پر ایسے اشعار جاری تھے جو شہادت کی خبر دیتے تھے اور یہ اشعار جب حضرت زینب نے سنے تو کہا: ”کیا میرا بھائی اپنی موت کی خبر مجھے دے رہا ہے؟“ اور یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئیں۔

روز عاشورا جو شہید خاک پر گرا، زینب نالہ کنال اس کی بالیں پر تشریف لے گئیں، اس کی تکلیف پر آنسو بہائے اور اس پر مرثیہ پڑھا۔ مگر وہی زینب شہادت حسینؑ کے بعد قطعی طور پر بدل گئیں۔ کسی بھی مقتل یا تاریخی کتاب سے اس بات کی گواہی نہیں ملتی کہ انہیں شہادت حسینؑ کے بعد بھی کبھی غش آیا ہو۔ زینب خونِ شہداء کی ذمہ دار وارث ہیں۔ شہیدوں کے بعد صرف وہی ہیں جو کربلا کے ریگزار پر سونے والوں کی زبان ہیں، یہ زینب ہی ہیں جو اپنے بھائی کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ پرسکون، فتح اور فخر سے لبریز ہیں اور طاقت و ظلم کا مضحکہ اڑا رہی ہیں۔ زینب نے اپنے فرض کو اس قدر خوش اسلوبی سے انجام دیا اور فاتح حسینؑ اور ان کے رفقاء کے پیغام شہادت کو اتنی زور سے فرازِ آسمان پر اچھالا ہے کہ اس کے دھماکے کی آواز تا قیامت، زمانوں اور فضاؤں میں گونجتی رہے گی۔ خود اپنی فریاد کی گرج سے انہوں نے محلوں کی دیواریں ہلا دیا اور ظالموں کے پیروں تلے زمین کو متزلزل کر دیا۔ ہاں یہی حقیقت ہے کہ زینبؑ پیغامِ شہادت اور حسینؑ کی تحریک انقلاب کی محافظ ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام تحریک کربلا کو جاری رکھنے والے

امام زین العابدینؑ، سید الساجدین، عاشور کے بعد کے ہیرو اور کربلا میں رونما ہونے والے واقعات کے بے مثال شاہد نے اپنی ذمہ داری کو دعا کے ذریعے پورا کیا۔ پیغام کربلا کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے دعاؤں کا اسلوب منتخب اور دعاؤں سے اپنے جہاد کا مورچہ تیار کیا۔ امام زین العابدینؑ گھٹن کے دور میں جدوجہد کے ایک عظیم معلم ہیں۔

واقعہ کربلا کے بعد شیعہ اور شیعہ قیادت سخت حالات سے دوچار ہوئے اور ظلم مکمل طور پر عوام کے حالات و تقدیر پر حاوی ہو گیا تھا۔ کسی قسم کی تحریک یا جہاد کا امکان نہ تھا۔ زمانے کے حالات اور حاکم کے اقتدار کے خلاف آخری انقلاب، آخری پرزور عزم اور احتجاج جو امامؑ نے کیا وہ بظاہر ختم ہو چکا ہے۔ سب قتل ہو چکے ہیں۔ اور ان انقلابیوں میں سے بظاہر صرف ایک جوان یعنی زین العابدینؑ زندہ بچ گئے تھے۔

ظاہراً امام زین العابدین علیہ السلام کے لئے کسی بھی طرح کی کوشش کا کوئی موقع نہیں تھا اور جدوجہد کو آگے بڑھانے کی کوئی امید نہیں تھی اور فرائض کی انجام دہی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ امام زین العابدینؑ کا دور عبد الملک بن مروان اور ولید بن عبد الملک جیسے طاقتور اموی خلفاء کا دور تھا جس میں حجاج جیسا ظالم و جابر اور خون آشام حاکم موجود تھا۔ عبد الملک نے کوفہ اور بصرہ کی گورنری حجاج کے سپرد کر دی تھی اور حجاج کا یہ عالم تھا کہ جس پر بھی اہل بیتؑ سے وابستہ ہونے کا اسے شبہ ہو جاتا اس کو بلا تامل اور بے دریغ تہ تیغ کر ڈالتا تھا۔ وہ ”اذیت رسانی“ اور خونخواری میں متوکل عباسی کی

نظیر تھا۔ ابن اثیرؒ ”کامل“ میں لکھتا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے دور اقتدار میں بیس ہزار سے زیادہ افراد کو تہہ تیغ کیا جن میں اکثریت شیعوں کی تھی۔

اس زمانے میں شیعوں کے اس بیدردی سے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کی وجہ یہ تھی کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد واقعہ کربلا کے نتیجے میں شیعوں کی متعدد تحریکیں وجود میں آ گئی تھیں۔ سب سے پہلے تو شہادت امام کے فوراً بعد ۶۱ھ میں ہی سلیمان بن صرد خزاعی کی سرکردگی میں ”تواین“ کے گروہ نے قیام کیا اور ۶۴ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا^(۱) اس کے بعد انقلاب مختار سامنے آیا اور مختار نے قاتلان حسینؑ میں سے بیشتر کو داصل جہنم کیا۔ خود ابن زیاد بھی مختار کی شمشیر سے قتل ہوا۔^(۲) یہی عوامل شیعوں پر ظلم و ستم اور ان کی سرکوبی کا باعث تھے۔ سماج کے ظاہری حالات کی وجہ سے اسلامی تحریک کے مٹ جانے اور فراموش ہونے کا خطرہ تھا اور پیغمبرؐ و اماموںؑ کا مقصد خطرے میں تھا۔ تمام تبلیغاتی، دینی اور دنیوی وسائل امویوں کے ہاتھ میں تھے۔ حکومت، محراب، منبر، مسجد، قضا (جج)، حکام اور لشکر سب کچھ خلیفہ کے قبضہ میں تھا اور اس اقتدار اور قوت کے مقابلے میں امام زین العابدینؑ تنہا تھے۔ دہشت گردی، وحشت، جرم اور قتل عام نے کسی بھی عملی تحریک کو ناممکن بنا رکھا تھا۔

جس دور میں امام زین العابدینؑ زندگی گزار رہے تھے، وہ دور ”مطلق معذوری“ کا دور تھا۔ امام ایسے مشکل حالات سے دوچار تھے کہ شہادت کا انتخاب بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ”شہادت“ یا ”جہاد بالسیف“ کے کچھ شرائط ہوتے ہیں: شہادت یعنی ایسی موت کا انتخاب جو اسلحے کی صورت میں تبدیل ہو سکے اور اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ مسلمان کشور کشائی کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے، ظالم کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ عبدالملک جیسا جابر تخت خلافت پر بیٹھا ہوا تھا اور امام کے پاس نہ عباس و علی اکبر جیسے مددگار تھے نہ زینب جیسی پیغام رساں۔ ان حالات میں شہادت ایک خاموش موت ہوتی نہ کہ ظلم کو کچلنے کے لئے ایک اسلحہ۔

(۱) بلاذری، انساب الاشراف، ج ۵ ص ۲۰۶

(۲) ابن قتیبہ، الامامة والسياسة، ج ۲ ص ۲۳

اس صورت حال میں سید سجادؑ نے جہاد کو آگے بڑھانے اور دوام بخشنے کے لئے ”دعا“ اور ”اشک“ کی حکمت عملی کو اپنایا۔ حکومت اور ظلم پر حملہ کرنے کے لئے ان اسلحوں کو اپنایا تاکہ اصلی اسلامی قدروں اور نظریات کا تحفظ کیا جاسکے۔ امام نے ”دعا“ سے کربلا کو دوام بخشنے ہوئے ظالم حکومت اور فکری، عقیدتی اور سیاسی انحرافات پر حملہ کیا۔

سید سجادؑ دعاؤں کے اسلحے اور اشکوں کی شمشیر سے ظالموں اور جباروں کے خلاف مصروف جنگ ہوئے اور اس طرح انھوں نے سنت شہدا کو نہ فراموش ہونے دیا، نہ کارنامہ حسینؑ کو ہندو اسپین کی فتح کے شور میں گم ہونے دیا۔

ان نازک حالات میں امامؑ نے تحریک کی رہبری کے تحفظ کی خاطر بظاہر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی اور کسی تحریک یا قیام کی علانیہ پشت پناہی نہیں کی مگر اکثر مستند شواہد سے ظاہر ہے کہ انقلابی ان ہی حضرتؑ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے جیسا کہ مختار نے بھی ابن زیاد کے قتل کے بعد اس کا سرجب خدمت امام میں مدینہ بھیجا تو امامؑ نے مختار کے اس اقدام پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ایک بہت بڑا مورخ یعقوبی لکھتا ہے: ”ان علیاً لم ير ضاحكاً قط منذ قتل ابوه الا في ذلك اليوم“ یعنی امام زین العابدینؑ کو ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد سے کبھی کسی نے ہنسنے نہیں دیکھا سوائے اس روز کے۔“

امامؑ نے کسی سیاسی تحریک یا انقلاب میں اعلانیہ شرکت کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سانحہ کربلا کے بعد محاذ حق سے متعلق سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ تحریک کی رہبری اور شہیدوں کے خون کے پیامی کا وجود قائم رہے اور اس حساس اور پر آشوب دور میں جب شیعوں کا قتل عام علی الاعلان جاری تھا، تحریک کی رہبری محفوظ رہ جائے۔ امام حسینؑ نے جو اقدام کیا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہو جو اس پیغام کو منتقل کر سکے اور اس وقت تک اس کی حفاظت کرے جب تک کہ اس کی ذمہ داری امام باقرؑ اور امام صادقؑ تک نہ پہنچ جائے اور وہ اسے نظام کی شکل دے دیں۔ یہ وہ مصلحتیں تھیں جو امام زین العابدینؑ نگاہ امامت سے دیکھ رہے تھے حالانکہ محمد

بن حنفیہ کو اس کا عرفان نہ ہو سکا تھا۔ امام زین العابدین بظاہر سیاسی مسائل سے دور تھے مگر حقیقتاً عصری نظام حاکم سے فکری اور نظریاتی بالواسطہ مقابلہ (مہابھارت) میں مصروف تھے۔

امام زین العابدینؑ خون شہداء کی پیغام رسانی میں جناب زینب کے ساتھ شریک تھے۔ امام چہارم جناب زینب کے ساتھ ساتھ دربار کوفہ و شام میں اپنی تقریر اپنی رفتار و گفتار غرض کہ ہر طرح پیغام شہداء کی منتقلی کے فرائض کو انجام دیتے رہے اور جناب زینب ہی کی طرح آپ بھی ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ واقعات کر بلا اور مقصد شہادت حسینؑ دنیا کے ذہنوں سے فراموش نہ ہونے پائے۔

سید سجادؑ نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ باطل نظام کی تیغ کشی میں صرف کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے امام کا اصلی ہتھیار، خطبہ اور دعا تھا۔ چنانچہ دربار یزید میں امام کا خطبہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ جب انہوں نے فضائل پیغمبر اور اہل بیت کے لئے اپنی زبان کھولی تو ان کا ہر جملہ یزیدی اور اموی نظام پر ایک ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ یزید جو ابوسفیان کا وارث تھا اور جو محمدؐ کے مقابلہ پر تھا اور اہل بیت کے حقوق کا موروثی غاصب بھی تھا۔ نیز جب امام دعاؤں میں محمدؐ و آل محمدؐ کے فضائل بیان کرتے ہیں تو حقیقتاً یہ بالواسطہ طور سے جاہلی قدروں کے حامل اور اہل بیت کے دشمنوں پر ایک حملہ ہے۔

صحیفہ سجادؑ کی دعاؤں کا تجزیہ

سید سجادؑ اپنی دعاؤں میں ایک طرف تو اسلامی بنیادی تعلیمات کو زندہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف ظلم کے خلاف جنگ کی مشعل کو بھی بجھنے نہیں دیتے۔ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں سید سجادؑ نے شیعہ عقیدہ کے تمام اصول یعنی معرفت خدا، نبوت، توحید اور امامت سے لے کر عدل و قضا و قدر تک بیان فرمائے ہیں۔ مسلمانوں کو ظلم اور ظالم کے خلاف بیدار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خواہ تمام فکری و اجتماعی قوتیں حاکم کے قبضہ قدرت میں کیوں نہ ہوں پھر بھی ایک مسلمان حریم اسلام کے

دفاع کے لئے ظالموں سے نبرد آزمانی کا فرض ادا کرنے پر مجبور ہے۔ □

صحیفہ سجادؑ کی دعاؤں انسانوں کے اجتماعی اور سیاسی درد راز و نیاز کی صورت میں بیان کرتی ہیں۔ امام دعاؤں میں بار بار ”نظام صالح“ اور ”حکومت حق“ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شہیدوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور ان پر درود بھیجتے ہیں۔ درمیان میں روئے سخن منصفوں اور انصاف چاہنے والوں کی جانب ہو جاتا ہے اور یہ ساری باتیں حاکمان وقت کے اوپر ضرب کاری ہوتی ہیں۔ سیاسی فضا کے اعتبار سے امام موجودہ یا سابق کے حکمرانوں اور ان کے دربار کی براہ راست مذمت نہیں کرتے تھے مگر حق و عدالت کے مورچوں کے نگہبانوں کو مخاطب کرتے ہوئے موجودہ نظام اور مطلوبہ نظام کا فرق ظاہر کر دیتے تھے تاکہ سننے والوں کو ”موجودہ“ اور ”مطلوبہ“ نظام کے درمیان مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور اموی حکومت کی خرابیاں ظاہر ہو جائیں۔

صحیفہ کاملہ کی دعاؤں انسان کو سماج سے گریزاں نہیں کرتیں، نہ انسان کو معاشرے سے دور کر کے عزالت نشینی پر مجبور کرتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس انسان میں روح عمل کو بیدار کرتی ہیں۔ صحیفہ سجادؑ کی دعا کو ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ”خدا یا ہمیں قوت عطا کرتا کہ ہم سنت پیغمبرؐ کی حفاظت کریں، بدعتوں سے نبرد آزما ہوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دیں“ وغیرہ وغیرہ۔ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے گوشہ نشین عابد کی دعاؤں نہیں ہیں جو معاشرے اور اجتماع سے گریزاں ہے بلکہ یہ امام زین العابدینؑ کی دعاؤں ہیں جو امام مجاہدین بھی ہیں۔ امام ان دعاؤں میں کھلم کھلا خلیفہ یا اس کے دربار کا نام نہیں لیتے مگر ایک ایک خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مذمت ضرور کرتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد اس نظام کی حقیقت کو آشکار کرنا اور اسے رسوا کرنا ہے۔

اللہم انی اعوذ بک من هیجا الحرص۔۔۔۔۔ والحاح الشهوة والقاطی الکلفة وایثار الباطل علی الحق۔۔۔۔۔ وسوء الولایة لم تحت ایدینا۔۔۔۔۔

یعنی ”خداوند! تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ لالچ، ہم پر غلبہ پاجائے، نفس پرستی ہم پر

مسلط ہو، ہم تجل پرستی اختیار کریں، حق کی موجودگی میں باطل کا انتخاب کریں اور جو ہماری ولایت حاکمیت میں ہیں ان سے برا سلوک کریں۔ اس دعا کا ہر جملہ نظام اموی پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد حکومت کے عملہ اور ارکان کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں: او نعصد ظالمنا ونخذل ملهوا فاعني خدايا ہمیں ان لوگوں میں قرار نہ دے جو ظالموں اور جابروں کا ساتھ دیتے ہیں اور مظلوموں کو بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں^(۱) ”لا تجعل للظالمين ظهيراً“ یعنی ستم گاروں کا پشت پناہ نہ قرار دے“ اس طرح صحیفہ کاملہ میں سید سجادؑ نے دعاؤں کی صورت میں تمام اجتماعی اور سیاسی سماجی درد کا اظہار کر دیا ہے۔

صحیفہ کاملہ کی دعاؤں کے تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید سجادؑ حاکم طبقہ کے صفات کا اظہار اور ان کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے اسلامی معاشرے کو اپنا معاشرہ بھی سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ پوری امت کی فکر میں رہتے ہیں۔ سیاسی مسائل اور سرحدوں کے حالات بھی نگاہوں سے دور نہیں ہیں۔ صحیفہ کاملہ کی ستائیسویں دعا جو مفصل ترین دعاؤں میں سے ایک ہے اسلامی قلمرو کی سرحدوں کے نگہبانوں کے لئے مخصوص ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”خداوند! مسلمانوں کی سرحدوں کو عزت کے ساتھ قائم رکھ، خدا یا ان سرحد کے نگہبانوں کو اپنی قوت سے مدد دے، خدا یا! اپنی عنایت سے ان کے حقوق میں برکت عطا کر، خدا یا ان کی تعداد بڑھا، خدا یا ان کے اسلحوں کو کاٹ عطا کر، ان کی جماعت کی حفاظت کر، ان کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کر اور ان کی کار سازی کر۔“

اسی دعا سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ایسے نہ تھے جو گوشہ نشینی میں ہوں اور انہیں پوری امت کی فکر نہ ہو۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف محمد رضا حکیمی بتاتے ہیں کہ اس دعا میں مسلمانوں کے لئے اتحاد اور عبرت کا درس موجود ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اس دعا میں ہر جگہ ”مسلم“، ”مسلمین“ اور ”اہل ثغور“ یعنی سرحد اور قلعہ کے محافظ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جو مسلک و فرقہ سے ہر اس شخص

کے لئے ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ پڑھتا ہے، سیاست اسلامی کے نقطہ نظر سے یہ ایک بہت بڑی اور گہری تعلیم ہے تاکہ تمام مسلمان، شیعہ و سنی اس بات کو سمجھ لیں کہ جہاں دنیائے اسلام کا معاملہ ہو اور خارجی دشمن مقابلے پر ہو تو مصالح اسلام کو وسیع انظری سے (گروہ اور فرقہ سے قطع نظر) سوچنا چاہئے۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے ان مصالح کی ہمیشہ رعایت کی ہے اور شیعہ حق و معارف کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ اسلام اور تمام مسلمانوں کے مصالح سے کبھی چشم پوشی نہیں کی ہے۔ اب ہم شیعوں کو چاہئے کہ اس تعلیم کو اپنا شعار بنالیں۔ کوئی مصنف، کوئی واعظ اور کوئی مقرر اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ وہ دین اور تشیع کے نام پر مصالح اسلام سے چشم پوشی کرے اور ائمہ کی ولایت کے نام پر ائمہ ہی کے دستور کو روند ڈالے۔ یہ تمام باتیں فرائض شیعہ سے، دین کے حقیقی مقاصد سے، ائمہ کے دستور و میراث سے، دنیا کے مسائل اور عالمی سیاست سے ناواقفیت اور جاہلیت کی پیداوار ہیں۔“^(۱)

سید سجادؑ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں نظریات، ذمہ داریاں، شعار اسلام کی حقیقی ضروریات، حکومت اور مخالف اجتماعی قوتوں کے خلاف مورچہ بندی کا اعلان کرتے ہیں اور تمام اسلامی دستور اور شیعہ اصولوں کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اس طرح سید سجادؑ یہ بتا رہے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کو کسی زمانے اور کسی حالت میں پر آشوب ماحول کو فرائض اور جدوجہد سے فرار اور گوشہ نشینی میں بیٹھنے کا بہانہ نہیں بنانا چاہئے، بلکہ اسے چاہئے کہ ہر حال میں موجودہ زمانہ اور حالات کے مطابق مقابلہ کے نئے طریقے ایجاد کرے اور انہیں بروئے کار لائے۔ ان حالات میں جبکہ اموی ظلم و ستم اور جبر و تشدد اپنی انتہا پر تھی اور عبد الملک اور ولید جیسی جہنمی قوتیں ایشیا یورپ اور افریقہ پر حکمران تھیں، سید سجادؑ نے دعاؤں اور اشکوں سے سلسلہ جہاد کو جاری رکھا، جہاد حسینی کی مشعل کو بجھنے نہ دیا اور کربلا کے کارناموں کو جن کی یوم عاشورا کے بعد سے زینب نے حفاظت کی تھی حکومت کے پروپیگنڈہ اور شور و غل میں فراموش نہیں ہونے دیا۔

سید سجادؑ نے آئندہ نسلوں کو یہ ذہن نشین کرادیا کہ جو دور مطلقاً مجبوری کا دور ہو، ایسے دور میں بھی اگر مسلمان صاحب ارادہ اور ذمہ دار ہو اور کامیابی حاصل کرنا چاہے تو حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اسلامی جہاد کی لغت میں ”چاہنا“ ”سکنے“ کی ضمانت ہے۔

میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ سید سجادؑ کا زمانہ نہایت ہی پر آشوب زمانہ تھا، حق پکچل دیا گیا تھا اور حق پرستوں کا قتل عام کر دیا گیا تھا، حکومتی مذہب مسلط ہو گیا تھا۔ حکومت کی فوجیں تمام قلمرو اسلامی پر قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ لوگوں کی توجہ کشور کشائی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ان حالات میں مقابلہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ مگر سید سجادؑ بتاتے ہیں کہ ان ناسازگار حالات میں بھی مقابلہ ہو سکتا ہے، اور مقابلہ کرنا ہی چاہئے۔ اور ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی ہے۔ سید سجادؑ نے امت محمدی کو یہ درس دیا ہے کہ اگر وہ حادثہ کر بلا کے بعد کے حالات سے بھی دوچار ہو اور تمام افراد سوائے ایک فرد کے قتل ہو جائیں اور دین کی حفاظت کے لئے کوئی نہ بچے سوائے ایک فرد کے تو یہ ایک فرد بھی فرائض کی انجام دہی سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ مقابلہ کی راہیں نکالے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید سجادؑ صرف زین العابدینؑ ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخی مجاہدین کے سردار اور سربراہ بھی ہیں۔ بعض ذاکرین کے بیانات سے عوام کے ذہنوں میں سید سجادؑ کی جو تصویر آتی ہے، اس سے ایک بیمار اور کمزور انسان کا تصور ابھرتا ہے۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ حادثہ کر بلا کے دوران سید سجادؑ کچھ دنوں تک بیمار تھے اور یہ بھی مصلحت ایزدی تھی کہ اس ترتیب سے وارثان امامت میں سے ایک وارث شہیدوں کے پیغامات کو پہنچانے اور امت کی رہنمائی کے لئے باقی رہ جائے، مگر اس وجہ سے ان کے سلسلے میں ایک دائم المرض کی تصویر کھینچ دینا تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ امام بہت ہی قلیل مدت تک بیمار رہے۔ اس کے بعد دیگر ائمہ کی طرح امامت کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔

موسسہ در راہ حق سے شائع ہونے والی کتاب ”پیشوائے چہارم، امام سجادؑ“ (ص/۱۶)

میں اس سلسلہ میں لکھا ہے: ”بہت سے انجان لوگ جب امام چہارم کا نام لیتے ہیں تو اس کے ساتھ

بیمار کا لقب بڑھا دیتے ہیں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہیں کہ امام ہمیشہ بیمار ہی رہا کرتے تھے اور اسی وجہ سے بعض لوگ اپنے ذہنوں میں امام سے متعلق ایک ایسے انسان کا تصور رکھتے ہیں جو بہت بیمار، نحیف، نڈھال ہو اور جس کا چہرہ ضعف سے زرد ہو رہا ہو۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جو لوگ تاریخ اور امام کی زندگی سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ تمام عمر بیمار نہیں تھے، صرف کر بلا میں کچھ عرصہ تک بیمار تھے۔“ (۱)

محمد رضا حکیمی لکھتے ہیں: ”ایسے تمام ذاکرین جو امام سجادؑ کو بیمار اور نحیف شکل میں پیش کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چند افراد کو رلادینا حقیقت کو مسخ کر دینے سے زیادہ اہم ہے۔ مقدس پیشواؤں اور کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے مصائب کے سلسلہ میں اس طرح کے نتائج اخذ کرنا، شیعہ عقائد سے خیانت، ائمہ کی عظیم شخصیت کی توہین اور تاریخ کے بہادر اور شجاع افراد کے حق میں ایک جرم ہے۔“

جس شخص کی ایک بیمار و ناتواں کی شکل میں تصویر کشی کی جاتی ہے، یہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کی شعلہ بار تقریروں سے ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر حاکم کا دربار لرز جاتا ہے، جو سماجی و سیاسی مسائل کے لئے دعا گو رہتا ہے اور جس کے زیر سایہ انقلابی کارنامہ انجام دینے والے بزرگوں نے پرورش پائی ہے۔ امام محمد باقرؑ جو باقر العلوم، تدوین مکتب کا آغاز کرنے والے تھے اور جناب زید جنہوں نے دین و مذہب کے لئے قیام کیا اور بے مثال کارنامہ انجام دیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔

امام کے عرفانی پہلو اور علمی بلندی

ائمہ نہ صرف معاشرے کی سماجی و سیاسی ضروریات کی طرف متوجہ رہا کرتے تھے اور اجتماعی زندگی میں عملاً شریک رہتے تھے، بلکہ باطنی درجات اور عرفان کی گہرائیوں میں بھی درجہ کمال پر فائز تھے اور خدائی منبع علم سے براہ راست اکتساب فیض کرتے تھے۔ امام کی باطنی اور روحانی کشش

(۱) پیشوائے چہارم (ناشر: موسسہ در راہ حق) ص ۱۱۷ و ۱۱۸

بھی لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی تھی۔ ائمہ پر خدا کی خصوصی عنایت ہوا کرتی تھی اور معارف باطنی پر انہیں پورا اختیار حاصل تھا۔ امام چہارم کی کرامات کی ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف آپ کی موجودگی سے لوگوں نے ہدایت پائی ہے۔

سید سجاد عبادت و ریاضت کے لئے اس قدر مشہور تھے کہ آپ کو ’سید سجاد‘ اور ’زین العابدین‘ جیسے القاب ملے۔ بعض روایات سے امام کے عرفانی حالات کا علم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی ایک روایت کے مطابق امام کی عرفانی حالت کا یہ عالم تھا کہ حج کے موقع پر احرام باندھتے وقت کلمہ ”لبیک“ کہتے ہوئے امام پر لڑھکا رہا اور یہ کیفیت اس قدر شدید تھی کہ سب لوگ متوجہ ہو گئے۔ جب امام سے اس حالت کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے جواب دیا: ”میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں لبیک کہوں اور جواب میں ”لا لبیک“ سننے کو ملے۔“

جو لوگ اس قدر گہرے عرفانی حالات کے حامل ہوتے ہیں، وہی اس دنیا کے برگزیدہ ترین لوگ ہیں، ان کے عمل کے مقابلے میں بہشت کم مایہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے کو پروردگار عالم کے حضور میں پاتے ہیں۔ علمی کارناموں اور منزلتوں کے لحاظ سے بھی امام سجاد ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ دعا کے ذریعے ہدایت کے علاوہ ایسے شاگرد تیار کئے جو اسلام کے پیغام حقیقی کے محافظ اور شیعہ عقائد کے مبلغ تھے۔ سعید ابن مسیب، سعید بن جبیر یہ دو شیعہ فاضل امام چہارم ہی کے پروردہ تھے۔ امام سے ”صحیفہ کاملہ“ کے علاوہ ”حقوق“ کے موضوع پر ایک رسالہ بھی نقل ہوا ہے جو ”تحف العقول“ میں تقریباً مکمل درج ہے۔

اس طرح سید سجاد اسی تحریک کو جاری رکھنے والے تھے جس کی راہ میں علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ شہید ہوئے۔ حسینؑ نے ”شہادت“ کو زینبؑ نے ”خطبات“ کو اور سید سجادؑ نے ”دعا“ کو پیغام رسانی کا وسیلہ بنایا۔ سید سجادؑ نے اپنی رفتار، گفتار، خطبات، دعا اور آنسوؤں سے تحریک کی روح کو زندہ رکھا، لوگوں میں نظریاتی بیداری پیدا کی اور عظیم فرائض کی انجام دہی کے لئے زمین ہموار کی، وہ بھی اس زمانے میں جب سارا ”اقتدار“ دشمن کے ہاتھ میں تھا۔ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں کو اسلام کی انقلابی

تہذیب کے نعروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ سید سجاد دعاؤں کے اسلوب سے کارحسینی انجام دیتے ہیں اور یزیدوں کے لئے امن و امان کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتے۔

باطل کو رسوا کرنے کے لئے حسینؑ نے ”خون“ کا اسلوب جنگ اپنایا، زینبؑ نے ”خطابت“ کا اور زین العابدینؑ نے ”دعا“ کا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فکری انقلاب کے علمبردار

آسمان ولایت کے پانچویں خورشید کا نام محمدؑ اور لقب باقر ہے۔ ہمارے ائمہ میں صرف محمد باقر ہیں جو پدر و مادر دونوں طرف سے پیغمبر گرامی کی اولاد ہیں۔ آپ کی والدہ حضرت ام عبد اللہ امام حسنؑ کی دختر گرامی تھیں۔ امام باقرؑ ۵۷ھ یعنی امام حسنؑ کی شہادت کے پانچ سال بعد اور عاشورائے حسینی سے چار سال قبل پیدا ہوئے۔

پیغمبرؐ دین لائے، علیؑ اور حسنؑ نے ”جہاد“ و ”صلح“ کے ذریعہ ”جاہلیت کی بغاوت“ اور امویوں کے بتدریج گھاؤ کرنے والے جرائم کا مقابلہ کیا اور مکتب کے اصالت کی حفاظت کی کوشش کی۔ امام حسینؑ نے دوسرے اسلحے یعنی شہادت کے ذریعہ خوابیدہ مسلمانوں کو جگایا اور دین کے پودے کو اپنے خون سے سنبھل کر بار آور کیا۔ اور اس کے پھولنے پھلنے کی ضمانت لی۔ جناب زینب اور سید سجادؑ ”خون حسینؑ“ کے پیغامبر تھے۔ انہوں نے اپنے فرائض کو ”خطابت“ اور ”دعا“ کے ذریعہ انجام دیا۔ یہاں تک کہ دین کی تدوین و اشاعت کی باری آئی۔ اس عظیم ذمہ داری کا بار امام محمد باقرؑ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔

امام محمد باقرؑ اور اشاعت دین

دین کی استدلالی تدوین و اشاعت چند اعتبار سے بہت ضروری تھی:

(الف) اولاً اس وجہ سے کہ اس سے پہلے کے دور میں جہاد بالسیف، سیاسی اقتدار اور ظلم و ستم، مصائب اور گھٹن کے ماحول میں ائمہ اہل بیتؑ کے نقطہ نظر کی تدوین و استدلالی انداز میں اشاعت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اکثر ذہنوں میں شیعہ عقائد کے اکثر گوشے واضح نہیں

ہو سکے جب کہ اس کے انقلابی اور نزاعی پہلو زیادہ سختی کے ساتھ ذہن نشین تھے۔ ان عقائد اور فکری بنیادوں کا غیر واضح ہونا انحراف اور تفرقہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس زمانے میں شیعوں میں کیسانہ اور زیدیہ کی طرح دوسرے فرقے بھی وجود میں آ گئے تھے۔ ان مسلکوں اور فرقوں کی تمام تر توجہ سیاسی اور جنگی مسائل کی جانب تھی اور عقیدہ امامت سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ حقیقی ائمہ کی رہبری سے دور تھے۔ ان اسباب کی وجہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ جلد از جلد فقہی و کلامی مسائل کی اشاعت کے لئے شیعہ نظریات کی تدوین ہو جائے۔

(ب) گذشتہ ہادیان دین کی کوششوں کے نتیجے میں بالخصوص عاشورائے حسینی کے بعد سیاسی نقطہ نظر سے شیعہ کافی مضبوط ہو گئے تھے۔ ان کا وجود دائمی شکل اختیار کر چکا تھا اب اس بات کی ضرورت تھی کہ ان کی فکر، عقیدہ اور تہذیب کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے۔

(ج) ”مکتبہ فکر“ کی تدوین اور اس کی استدلالی اشاعت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ اسی زمانہ میں ایک طرف یونان، ہند اور قدیم ایران کی فکری اور فلسفی روانی، مسیحی، بودھ، زردشتی، مانوی اور مزدکی عقائدی روانی، راہبانہ اور صوفیانہ مسالک کی کشش، تو دوسری طرف یونانی فلسفیوں کے جمہوریت (ڈیموکریسی)، نوافلاطونی اور ارسطوی مکاتب فکر دنیائے اسلام میں نفوذ کر رہے تھے۔ غیر مسلموں کی تحریروں کا ترجمہ اور کلامی بحث و مناظرے شروع ہو چکا تھا۔ اس طرح اس زمانے میں پیغام حق اسلام کے وجود کو سیاسی خطرہ سے زیادہ فکری، تہذیبی اور دوسرے نظاموں اور مسالک کی فکری و تہذیبی یلغار کا خطرہ تھا۔ اسی وجہ سے امام باقرؑ اور اس کے بعد امام صادقؑ، جو قوم کے حقیقی رہنما اور اسلام کی عزت کے نگہبان تھے، نظریاتی محاذ پر اسلام کی حمایت کی پر زور سعی کی۔

(د) اسی زمانہ میں برسر اقتدار نظام ”درباری اسلام“ کی تدوین کی فکر میں تھا اور اسے ”حقیقی اسلام“ کے نام سے روشناس کر دینے کی فکر میں تھا، ایسا اسلام جو اموی اور عباسی خلفاء کی خود سری کے لئے سازگار اور اس وقت کی ”موجودہ وضع“ کا محافظ ہو۔ حکومت سے وابستہ محدثین، فقہاء، خطباء اور متکلمین اس سلسلے میں شدت سے کوششیں کر رہے تھے۔ ہزاروں جعلی حدیثیں عام ہو چکی تھیں۔

اس بات کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اسلام کی انقلابی تعلیمات کو بدل نہ دیا جائے اور فراموش نہ کر دیا جائے، ان حالات میں حکومت سے سیاسی یا فوجی مقابلہ سے زیادہ ضروری تھا کہ حقیقی اسلام اور ”نظریاتی مقابلہ“ کی تدوین کی جائے۔

(ھ) پہلی بار اس زمانے کے سیاسی حالات نے اس قدر مہلت دی تھی کہ شیعہ نسبتاً آزاد فضا میں اپنے عقائد کے نقوش کو واضح کر سکیں۔ اس زمانے میں بنی امیہ کی حکومت تباہی کی طرف جارہی تھی۔ اسلامی مملکت کے اطراف و جوانب میں مسلح تحریکیں سراٹھار رہی تھیں، اموی اقتدار روبہ زوال تھا اور عباسیوں کا استبداد ابھی برسر اقتدار نہیں آیا تھا۔ دشمنان شیعہ آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ نتیجہ کے طور پر شیعوں کو اہل بیت کی تہذیب کی تبلیغ اور ترویج کے لئے مناسب موقع مل گیا تھا۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر امام محمد باقرؑ کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو شیعہ نظریات کی تدوین اور اس کو استدلالی طریقے سے پیش کرنے اور فکری و تہذیبی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا دور ہے۔ امام باقرؑ کے زمانے میں اس دور کا آغاز ہوا اور امام صادقؑ کے زمانے میں یہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

امام محمد باقرؑ کے زمانے کے حالات

امام محمد باقرؑ کے زمانے کے حالات سید سجادؑ کے گھٹن والے دور سے قدرے مختلف تھے۔ اب اموی حکومت کی زمام حجاج جیسے جلاد کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اس کے باوجود ائمہ کے لئے بہت ساری پابندیاں اور محدودیتیں تھیں۔ حالات غیر متوازن تھے۔ کبھی کسی خونخوار حاکم کے اختیارات بڑھ جانے سے حالات سنگین ہو جاتے تھے تو کبھی نرم مزاج خلیفہ کے برسر اقتدار آنے سے حالات میں نسبتاً کچھ آزادی پیدا ہو جاتی تھی، جیسے عمر بن عبد العزیز کے دور میں امام کو نسبتاً آزادی حاصل تھی۔ اس وجہ سے کبھی امام کی زندگی کا کوئی رخ سید سجادؑ کی زندگی سے ملتا جلتا ہے تو کبھی کوئی رخ امام

جعفر صادقؑ کے زمانے سے مشابہت رکھتا ہے۔ □

پانچویں امام کا دور ۹۵ھ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ مقتدر ترین اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کی خلافت کا آخری دور ہے۔ ۹۶ھ میں ولید کی موت ہوئی۔ اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بارہ سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد علی الترتیب عمر بن عبد العزیز، یزید بن عبد الملک اور ہشام بن عبد الملک مسند خلافت پر قابض ہوئے۔

ولید بن عبد الملک نے اپنی خلافت کے آخری دور میں ہشام ابن اسماعیل کو مدینہ کی گورنری سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ عمر بن عبد العزیز کو مقرر کیا۔ عمر بن عبد العزیز چوبیس سالہ جوان تھا اور ابتدا ہی سے دین کی طرف مائل تھا۔ اس وجہ سے اس نے مدینہ میں آتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ امام باقرؑ کے حضور میں حاضر ہوا اور تعظیم بجالایا۔ اس طرح عمر بن عبد العزیز کے دور میں امام باقرؑ کو اصل اسلام پھیلانے اور فضائل اہل بیتؑ کو متعارف کرانے کا مناسب موقع ملا۔

ولید بن عبد الملک کی موت کے بعد امویوں کی طاقتور حکومت زوال پذیر ہونے لگی۔ سلیمان بن عبد الملک جو ولید کا جانشین ہوا، عیاش تھا اور انتظامی لحاظ سے عبد الملک اور ولید کا ہم پلہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کے دور میں امور حکومت کی بنیاد میں نمایاں کمزوریاں واقع ہوئیں۔

سلیمان کے بعد عمر بن عبد العزیز نے دو سال پانچ ماہ حکومت کی۔ اموی خلفاء میں عمر بن عبد العزیز ہی وہ تنہا خلیفہ تھا جس نے ظلم و ستم سے اجتناب کیا۔ اس کا جھکاؤ نسبتاً اسلام کی طرف تھا۔ اس نے امام، شیعوں اور علویوں سے متعلق سیاست میں نرمی برتی اور منبر پر جناب امیرؑ کی شان میں نفرین جیسی مذموم حرکت کو موقوف کر دیا۔ اس وجہ سے اس دور میں امام باقرؑ کو معارف اسلامی کی ترویج کا مناسب موقع ملا۔

عمر ابن عبد العزیز، جو اموی درباریوں کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا، اس کے بعد یزید بن عبد الملک برسر اقتدار آیا۔ اس نے چار سال ایک ماہ حکومت کی، مگر وہ بھی زیادہ تر محل اور عیش و نوش

میں مشغول تھا اور بنی امیہ کے جلد زوال کا باعث بنا، یہاں تک کہ حکومت کی باگ ڈور ہشام بن عبد الملک کے ہاتھوں میں آئی۔

جب ہشام نے عنان حکومت سنبھالی، اس وقت عراق اور اطراف میں مرکزی حکومت کا والی خالد القسری تھا۔ اس نے شیعوں کے لئے نسبتاً نرمی دکھائی مگر شیعہ ایمان علیؑ کے ساتھ اس کی نرمی کا حال جلد ہی حکومت پر کھل گیا۔ چنانچہ اسے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ یوسف بن عمر الثقفی کو جو خویشاں اور جلا دحا کموں میں سے تھا، حاکم مقرر کیا گیا۔ چنانچہ پھر سرکوبی اور ظلم کی سیاست بحال ہو گئی۔ مشہور مورخ دینوری لکھا ہے: ”لایدع احداً يعرف بموالاة بنی ہاشم ومودة اهل بیت رسول الله الا بعث الیه مجسیه عنده بواسطه“^(۱) یعنی ”جو بھی بنی ہاشم سے کچھ تعلق رکھتا تھا قید میں ڈال دیا گیا۔“

امام محمد باقرؑ اپنی زندگی میں اسی قسم کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے دوچار رہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ امام کے دور کے بعض حصے سید سجادؑ کے دور سے ملتے ہیں اور بعض حصے امام جعفر صادقؑ کے دور سے مماثلت رکھتے ہیں۔

گھٹن کے دور میں امامؑ کی حکمت عملی

گھٹن کے دور میں امام باقرؑ نے وہی رویہ اختیار کیا جو سید سجادؑ نے اختیار کیا تھا اور جدوجہد کا وہی اسلوب اپنایا جو سید سجادؑ کا تھا۔ اس دور میں امام زیادہ تر روحانی رہنمائی اور افراد کی کردار سازی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ان کے لئے سب سے اہم کام ”پیغام“ کی حفاظت تھا۔ امام مخفی اور نیم ظاہری طور پر شاگردوں کی تربیت میں مشغول رہے۔

بنی امیہ کے حکمران بھی ایک طرف تو شیعوں کا قتل عام کر رہے تھے مگر دوسری طرف حجاز، عراق، فارس اور تمام علاقوں کے لوگوں کے نزدیک ائمہ کی مقبولیت، اثر اور قدرواحترام کے پیش نظر

-

کر بلا سے ملے ہوئے شکست کے تجربہ کے پیش نظر ان میں ائمہ کو اعلانیہ شہید کرنے کی جرأت نہیں تھی، اسی وجہ سے وہ ہر خورانی پر اتر آئے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عوام میں اماموں کے اثرات سے خوفزدہ تھے۔

خود غرض اور ظالم اموی خلفا اماموں کے علمی اور روحانی مقام سے واقف تھے، اکثر تاریخی واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ حساس اور نازک مواقع پر وہ اپنی رہنمائی کے لئے اماموں کے محتاج ہوئے ہیں۔ ائمہ اہل بیتؑ نے بھی نظام خلافت کو کچلنے اور رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ دربار خلیفہ میں بھی امام نے پیغمبرؐ اور آل پیغمبرؐ کے فضائل کا اعلان کیا جس سے ابوسفیان و آل سفیان کی مذمت ہوتی ہے۔ اس نکتہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرہ کی رہبری امویوں نے غصب کی ہے پھر بھی اگر کسی معاملہ میں وہ دیکھتے تھے کہ اسلام کی عزت کا معاملہ ہے تو جناب امیر کی طرح اپنی رائے پیش کرنے اور رہنمائی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ”الحسان والمساوی“ (نبیہی، ج ۲ ص ۲۳۲) میں آیا ہے کہ جب خلیفہ نے غور کیا کہ قلمرو اسلامی میں چلنے والے رومی سکوں پر تثنیسی جملہ لکھا ہوتا ہے، تو اس نے حکم دیا کہ سکوں پر اس کے بجائے شعائر توحید نقش کیا جائے۔ شہنشاہ روم نے خلیفہ کو دھمکی دی کہ اگر ایسا ہوا تو وہ حکم دے گا کہ سکوں پر پیغمبرؐ کے لئے اہانت آمیز جملے نقش کریں۔ خلیفہ عاجز ہو گیا، جب کوئی اسے اس منحصر سے نجات نہ دلا سکا تو مجبوراً اس نے امام باقرؑ کو مدینہ سے بلوایا۔ چونکہ اسلام کا معاملہ درمیان میں آ گیا تھا، اس لئے امامؑ نے خلیفہ کی رہنمائی کی کہ مسلمان کاریگروں کو جمع کر کے اسلامی ٹکسال قائم کیا جائے جس میں اسلامی سکے ڈھالے جائیں۔ اس طرح اسلامی مملکت میں پہلی بار رومی سکے ترک کر دیئے گئے اور اسلامی سکے رائج ہوئے۔ غیروں کے مقابلے میں ہمارے ائمہ مسلمان معاشرہ کے تمام مصالح کو پیش نظر رکھتے تھے۔

مگر اسی حال میں امامؑ نے نظام ظلم پر حملہ، ظالم سے مقابلہ اور حاکموں سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ جب کہ حکومت کا عملہ امام کی مصروفیتوں سے باخبر رہتا تھا۔ ایک بار عبد الملک جو بنی امیہ کا

قوی ترین خلیفہ تھا مدینہ گیا۔ حاکم مدینہ عمر بن عبدالعزیز امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ”آپ ولید سے ملنے جائیں گے؟“ امام نے نفی میں جواب دیا۔ مگر پھر عمر بن عبدالعزیز نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہیں جائیں گے، اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ امام ولید کو خلیفہ نہیں سمجھتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کا منفی مقابلہ اس قدر اعلانیہ ہوتا تھا جس کی حکومت کو خبر رہتی تھی۔

ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ جب امام محمد باقر سیاسی، ثقافتی اور فکری سرگرمیوں میں مشغول تھے، تو اس کو اموی خلفاء نے کس طرح برداشت کیا اور انہیں قتل یا قید کیوں نہیں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ولید کے بعد اموی حکومت کی حالت کافی سقیم تھی۔ دنیائے اسلام میں چاروں طرف تحریکیں اور بغاوتیں سر ابھار رہی تھیں اور اباب حل و عقد ان شورشوں کو دبانے میں شب و روز مشغول تھے۔ دوسری بات یہ ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ کربلا میں کارنامہ حسینی اور زینب و سید سجاد کے افشائے حقیقت کی وجہ سے یزید کے بعد اموی خلفاء کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اماموں سے براہ راست الجھنے یا انہیں قید کرنے سے گریز کریں۔ چنانچہ انہوں نے منافقانہ طرز عمل اختیار کیا یعنی حقیقتاً وہ خواہ امام کے کتنے ہی دشمن کیوں نہ ہوں بظاہر عوام کے سامنے ان کی بڑی عزت کرتے تھے، مثلاً جب ولید بن عبدالملک مدینہ آیا اور مسجد میں امام کو دیکھا تو سر و قد کھڑا ہو گیا اور امام کو اپنے رو برو بٹھایا، حالانکہ اندرونی طور پر ولید امام کا سخت دشمن تھا مگر عوام کے سامنے امام سے اپنا لگاؤ ظاہر کرتا تھا اور یہ حسین کی شہادت اور زینب و سید سجاد کی مظلومیت کا نتیجہ تھا جس نے دنیا کے قوی ترین انسان کو مظلومیت سے خوفزدہ کر دیا تھا۔

نسباً آزادی کے دور میں امام کی حکمت عملی

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ پانچویں امام کا دور اتنا چڑھاؤ کا دور تھا۔ شیعوں کی فکری اور تہذیبی سرگرمی کے لئے کبھی کبھی اس قدر موقع مل جاتا تھا کہ امام محمد باقر نے اس سے فائدہ اٹھایا اور تدوین کتب اور معارف اہل بیت کو عام کرنے کا کام شروع کر دیا۔ (اسی کام کو امام صادق نے مکمل

کیا) اماموں کا ادراک عام ذی فہم حضرات جیسا نہ تھا بلکہ ”حکمت خداداد“ تھی اور یہ حضرات فیضان الہی کے سرچشمہ سے سیراب ہوتے تھے۔ مگر ہمارے لئے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ائمہ نے کن حالات میں کس قسم کی حکمت عملی اختیار کی، کیا کیا اقدامات کئے، کن حالات میں ”پیغام“ کو پھیلا یا اور کن صورتوں میں پیغام کو نظام کی شکل میں ڈھالا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر جن کی وضاحت اس باب کے ابتدائی صفحات میں کی جا چکی ہے امام باقر نے محسوس کیا کہ نظریات کی تبلیغ کا صحیح وقت آپہنچا ہے۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے انہوں نے نظریات کی تبلیغ کی ابتدا کر دی۔

امام باقر نے معارف عترت اطہار کو عام کرنے کی غرض سے ایک عظیم دانش گاہ کی بنیاد رکھی جہاں دنیائے اسلام کی علمی حلقہ سے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ممتاز شخصیتیں امام کے درس میں حاضر ہوتی تھیں اور اس معارف الہی کے سرچشمہ سے اکتساب فیض کرتی تھیں۔

اس خورشید امامت سے کسب فیض کرنے میں اسلام کے تمام فرقوں کے لوگ شامل ہیں اور اہل سنت کے جید علما میں سے کچھ حضرات کو امام باقر کی شاگردی پر فخر ہے جن میں زہری، عطاء بن جریج اور قاضی حفص بن غیاث کا نام لیا جاسکتا ہے۔

امام محمد باقر کے شاگردوں نے حدیث، تفسیر، فقہ، کلام اور معارف اسلامی کے تمام شعبوں کو علم و عرفان کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور ان میدانوں میں شیعہ نقطہ نظر کو مدون کیا ہے۔ مثال کے طور پر ابان بن تغلب جو علم قرأت قرآن اور فقہ اللغۃ میں یکتائے زمانہ تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کی مشکل تعبیروں کی شرح کتابی صورت میں ”غرائب القرآن“ کے نام سے لکھی۔ ابو جعفر محمد بن حسن ابی سرح اور اسماعیل بن عبدالرحمن السودی جیسے افراد اپنے زمانے کے عظیم ترین مفسرین قرآن میں سے تھے اور مسلمانوں کے لئے علم تفسیر کے ارتقا کی سمت راہ نما اور سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ جابر بن یزید جعفی اور یحییٰ بن قاسم ابوبصیر اسدی عظیم محدثین میں سے تھے۔ محمد بن مسلم نے امام باقر سے تیس ہزار حدیثیں نقل کی ہیں۔ علم الکلام میں عبداللہ بن

میمون اور زرارہ بن اعین نے علم کلام کے شیعہ نقطہ نظر کو مدون کیا۔ فقہ میں عامر بن معاویہ ذہنی، سالم بن ابی حفصہ، ابو یونس کوفی اور یحییٰ بن قاسم ابو بصیر اسدی جیسے افراد نے شیعہ فقہی نظام کی تدوین کے سلسلے میں اہم قدم اٹھائے اور یہ سب کے سب امام محمد باقرؑ کی درس گاہ کے پروردہ تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ”پیغام“ کو ”نظام“ میں ڈھالنے والے

مکتبی انقلاب کی تحریکوں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر تحریک کے تین مرحلے ہوا کرتے ہیں: ”پیغام“، ”اقدام“ اور ”نظام“۔ ہر تحریک ابتدا میں ایک پیغام کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقدام کے مرحلے سے گذرتی ہے اور آخر میں نظام کی صورت میں آجاتی ہے۔ تحریک جب تک پیغام اور اقدام کے مراحل میں رہتی ہے، اس وقت تک ’انقلاب مخالف‘ قوتوں اور کفر و شرک جیسے خطرات میں گھری رہتی ہے یا بالفاظ دیگر اس میں حیات تو ہوتی ہے مگر استحکام نہیں ہوتا۔ طاغوتی اور مخالف قوتیں ابتدائی مراحل ہی میں اس کا گلا گھونٹنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اور جب تحریک کی بنیاد مضبوط، گہری، فکری اور نظریاتی نہیں ہوتی تو طاغوتی قوتیں ”گرمی“ کے ختم ہونے اور شعلوں کے سرد ہونے کی منتظر رہتی ہیں مگر جب پیغام اقدام کے ساتھ ہو اور اقدام ”نظام“ کی شکل اختیار کر لے تو پھر تحریک خطرہ سے خالی ہو جاتی ہے۔

تاریخ اسلام میں بھی اس بات کے کافی ثبوت ملتے ہیں۔ امویوں اور عباسیوں کے دور میں ”کیسانیہ“ (پيروان محمد حنفیہ) اور زید یہ تحریکیں طاقتور ترین انقلابی تحریکیں سمجھی گئی ہیں۔ چونکہ یہ تحریکیں ’عمل زدگی‘ یعنی عمل کی مار اور کارروائی کی ٹوٹن کا شکار ہو گئیں، اقدام نے پیغام کو دبا لیا، اور پیغام نظام کی صورت میں نہ آسکا (تجربہ کا شکار ہو گئیں)۔ اسی لئے اموی اور عباسی طاقتوں نے اس تحریک کو صفحہ روزگار سے محو کر دیا۔

زید یہ تحریک کی حکمت عملی ’عمل زدگی‘ کی سمت انحراف کا شکار ہو گئی اور پیغام کو نظام کی صورت میں ترتیب دینے کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت زید اور ان کے

فرزند بیچی جنہوں نے اپنی تحریک سے حکومت کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا، ان کے زور و شور والے کارنامے طاق نسیاں کی نذر ہو گئے۔ چونکہ زید یہ تحریک کو نظریاتی پشت پناہی اور مستقل فکری بنیاد حاصل نہیں تھی، اس لئے رفتہ رفتہ دوسرے فرقوں میں جذب ہو کر ختم ہو گئی۔ اسماعیلیہ تحریک بھی اسی مقدر سے دو چار ہوئی۔ اسماعیلیہ فرقہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں ہجری میں اس قدر قوی تھا کہ اس نے خلافت میں ایک دھماکہ جیسی کیفیت پیدا کر دی تھی، الموت، طبرست اور بیر چند کے عوام میں اس کے عقائد و نظریات اس قدر مقبول تھے کہ ان علاقوں میں اس فرقہ نے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے اور سلجوقیوں کی خلافت اور ان کے اقتدار کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر وہ بھی چونکہ پیغام کو نظام کی منزل تک نہ پہنچا سکے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریک بھی جمود و انحراف کا شکار ہو کر رہ گئی۔

مگر شیعہ ائمہ کی خداداد حکمت عملی کی بنیاد یہ رہی ہے کہ پیغام کو اقدام کا جڑواں بنا کر اسے نظام کی شکل میں لے آیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ ہمیشہ اپنے تشخص، اپنے مذہب کی خصوصیت اور اسلامی انقلاب کی ماہیت کی حفاظت کرنے کے قابل رہے۔

ائمہ عترت علیہم السلام کی حکمت عملی کا مکمل مقصد اسلام کی حفاظت، مکتب کا دفاع اور اسلام دشمن قوتوں سے مستقل نبرد آزمائی تھا۔ انہوں نے وقت کی ضرورت اور حالات کے لحاظ سے مختلف عنوان کے طریقہ کار اپنائے۔ کبھی مسلحانہ تحریک، کبھی گہری فکری جنگ اور علوم و معارف اسلامی کی اشاعت سے اور کبھی دعاؤں کے ذریعہ پیغام رسانی کے اس عظیم فریضہ کو انجام دیا ہے۔

شیعہ قیادت کبھی بھی اصول کو پیچھے کرنے اور عمل کی مار کا شکار نہ ہوئی۔ کیسانہ اور زید یہ تحریکوں کے برخلاف سیاست پر نظر نہیں رکھی بلکہ ساری توجہ اصول و نظریات پر مرکوز رکھی۔

ہمارے ائمہ نے ہمیشہ اقدام کو پیغام کے ساتھ رکھا اور اس کے بعد نظام کی صورت میں پیغام کی تدوین کی ضرورت پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ہماری تاریخ میں (فکری کاوشوں جیسے) نہج البلاغہ ہمیشہ آگے رہا اور صفین اور جمل جیسی کوششیں پیچھے رہی ہیں۔ ہمیشہ سر حسینؑ، زینبؑ اور سید سجادؑ کی

پشت پناہی رہی۔ زینب اور امام سید سجادؑ نے پیغام کو منتقل کیا اور اس کے بعد امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے پیغام کو نظام کی منزل تک پہنچایا۔

امام جعفر صادقؑ اس تیسرے مرحلہ یعنی نظام کی صورت میں پیغام کی تدوین کے مرحلہ کے عظیم مظہر ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اس واحد خدائی حکمت عملی کو مکمل کرنے والے ہیں جو آدمؑ سے شروع ہوئی اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور ان کی اولاد کے ذریعہ جس کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اسلام کے اس مورچہ کی دفاعی حکمت عملی کا یہ عالم ہے کہ کربلا میں حسینؑ نے اپنا خون بہا کر یزید کو شکست دی۔ امام جعفر صادقؑ نے مکتب کی تدوین کی حکمت عملی سے ہشام اور منصور کی قوت کو ناکارہ کر دیا اور امامت کے مقدس مقصد کو صحیح تعلیمات اسلام کی تدوین کے ذریعہ نظام کی صورت میں لا کر مستحکم کر دیا۔ اس کے بعد شیعہ تحریک ایسی بے خوف و خطر ہو گئی کہ بدترین حالات ظلم و ستم، جس، درباری نظام کے حملوں اور وابستہ عناصر کے باوجود شیعہ تحریک دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی اور تاریخ میں سچے اسلامی انقلاب کا جھنڈا لہرا کر رہا۔

امام صادقؑ کے بارے میں دو طرز فکر موجود ہیں۔ ایک طرز فکر جو رائج ہو گیا ہے اور مغربی دانشوروں نے بھی اس کے رواج میں کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ یہ طرز فکر امام جعفر صادقؑ کو ایک ایسے عظیم مفکر کے عنوان سے روشناس کراتا ہے جو خود کو سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رکھ کر درس و تدریس اور شاگردوں کی تربیت میں مشغول رکھتے ہیں۔ یہ طرز فکر امام کو زیادہ سے زیادہ ”فقہ جعفری“ کے تدوین کنندہ کی حد تک پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے۔ اس کے رائج کرنے والے وہ ہیں جو سماجی اور سیاسی مجاہدہ کے فرائض سے خود کو اور معاشرے کو مستثنیٰ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پچھلے برسوں میں اس فکر کے مقابلے میں بعض انقلابی یا انقلاب نما عناصر کی طرف سے ایک دوسرا طرز فکر پیش ہوا۔ اس کی بنیاد بھی ایک انحراف آمیز طرز فکر پر ہے۔ ان تجزیات میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ امام صادقؑ کو ایسے سیاسی نبرد آزما کی حیثیت سے پیش کیا جائے جس کا مقصد ہمیشہ ایک سیاسی انقلاب کی تیاری تھا۔

یہ طرز فکر بھی ایک انحرافی خیال پر مبنی ہے اور یہ امام کے ان کاموں کی قدر کو گھٹا دینا ہے جن کی بنیاد نظریاتی ہے یا جو تدوین مکتب اور ذمہ دار مومنین بنانے سے متعلق ہے۔ یہ گروہ معذرت خواہانہ لہجے میں ان تاریخی شواہد کی تاویل اور توجیہ کرتا ہے یا یکسر نظر انداز کرتا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام نے اپنی بیشتر توجہ معارف اسلامی کے پھیلانے پر مبذول کر رکھی تھی۔

ائمہ کی زندگی کے مطالعہ کے سلسلے میں صحیح اصول یہ ہے کہ انہیں ہو، وہو، ویسا ہی پیش کیا جائے جیسے وہ تھے۔ ان کی پیروی اور اپنی فکری اور عملی زندگی کو ان کی سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے نہ کہ ان کو ویسا پیش کیا جائے جیسا ہم پیش کرنا چاہیں اور ان کی سیرت کو اپنے حسب منشا ظاہر کریں۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے امامت کی خدائی بصیرت کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ اس زمانے میں ان کی عظیم تر ذمہ داری تدوین مکتب، شیعہ عقائد کی بنیادوں کو مستحکم کرنا، معارف اسلامی اور الٰہی نظریہ کو پھیلانا ہے۔ ائمہ کا کام محض ایک ”فاضل اسلامیات“ محقق اور دانشور کا کام نہیں ہے بلکہ ایک خدائی رہبر کے فرائض اور اسلامی انقلابی تحریک کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ہے۔ نگاہ امامت نے ان پر ظاہر کر دیا تھا کہ ان کی اصل ذمہ داری ”فرد سازی“، معاشرہ سازی، تدوین مکتب اور مومن اور انقلابی عناصر کی پرورش ہے۔

امام نے تاریخی اجتماعی اور سیاسی ضرورت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ اس زمانے کے کیسانہ اور زیدیہ فرقوں کی طرح بغیر سوچے سمجھے مقابلہ کرنے کے بجائے نظریاتی جنگ اور مکتب اسلام کی ترتیب و تدوین اور عوام میں اس کی تبلیغ زیادہ ضروری ہے تاکہ دربار اور حکومت کی تبلیغ کرنے والے اہل بیتؑ کی تعلیمات کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

امام نے اس دور کو شیعہ مسلک کی تبلیغ اور نظریات کی تدوین کے معرکے کے لئے کیوں مناسب سمجھا؟

سیاسی نکتہ نظر سے امام جعفر صادقؑ کا دور امویوں اور عباسیوں کے بیچ سخت سیاسی

رقابت، سرمایہ دارانہ جنگ اور اقتدار کی کشمکش کا دور تھا۔ ایک طرف اموی دور حکومت کا زوال ہو رہا تھا، دوسری طرف عباسی اقتدار بڑھ رہا تھا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ دونوں دیوپیکر تھیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے سردھڑکی بازی لگا رہی تھیں۔ اس طرح مدینہ میں جو یہ مختصر سنہرا موقع ہاتھ آ گیا تھا اگر وہ ضائع ہو جاتا تو شاید دوبارہ ایسا موقع ہاتھ نہ آتا۔ یہ حالات امام محمد باقرؑ کے دور سے شروع ہوئے اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں پایہ تکمیل کو پہنچے۔ اسی وجہ سے امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے اس غیر معمولی نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاگردوں کی تربیت اور معارف اسلام کی تبلیغ کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ امام صادقؑ نے اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی کہ ان کا ہر شاگرد معارف اسلامی کے کسی نہ کسی شاخ کارکن رکین اور انسانی علوم و آگہی کا بانی بن گیا۔

تہذیبی حالات کے علاوہ اس دور کا ایک عظیم تقاضا یہ بھی تھا کہ اسلام کی صحیح شکل و صورت کی حفاظت کے لئے تدوین مکتب کا کام انجام دیا جائے۔

امام جعفر صادقؑ کا دور عالم اسلام میں رخنہ اندازی کا دور دورہ تھا اور غیر اسلامی افکار و نظریات کے نفوذ کا دور تھا۔ یونانی افکار، بودھ خیال، مسیحی، مزدکی اور الحادی نظریات اسلامی دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ ”مشرق زدہ“ اور ”مغرب زدہ“ افراد مسلمانوں کو کھلم کھلا دعوت مناظرہ دے رہے تھے اور اسلام سے مقابلہ پر اتر آئے تھے۔ ان غیر اسلامی افکار کے پھیلنے کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:-

(الف) دنیائے اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کی توسیع کی وجہ سے اسکندریہ، ہرات اور گندیشاپور جیسے اسلامی افکار کے مراکز عالم اسلام میں شامل ہو گئے تھے اور غیر اسلامی مفکرین دنیائے اسلام کو پرانندہ کر رہے تھے۔

(ب) صاحبان اقتدار کی ہمت افزائی اور سرپرستی نے جو معاشرے کی توجہ اصلی مسائل اجتماعی و سیاسی و دینی درود کی طرف سے ہٹا کر فروعی مسائل کی طرف مبذول کر کے غیر اسلامی فلسفی اور کلامی

افکار کو تقویت دی تھی۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ اسلام کے اصلی نظریات کی روشنی میں سے متعلق فقہ، کلام اور فلسفہ وغیرہ سے متعلق مسائل کو مدون کیا جائے تاکہ معاشرہ فکری حیرانی اور مذہبی آوارگی سے دوچار نہ ہونے پائے۔

اسی دور میں حکمران طبقہ نے بعض وابستہ عناصر کو اپنا آلہ کار بنالیا تھا تاکہ وہ حالات کے مطابق نظام اسلام کی رسمی تفسیر کریں، اس طرح حقائق اسلامی کی غلط تفسیر اور اسلام کے اصلی چہرہ کے مخ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے پانچویں اور چھٹے امام نے تدوین مکتب کے کام کو اپنی سرگرمی کا محور بنایا۔

مگر امام جعفر صادق اسی حالت میں جب وہ اپنی تمام تر توجہ ”فرد سازی“، ”امت سازی“ اور دین و مکتب کی اشاعت پر مرکوز کئے ہوئے تھے، سیاسی و اجتماعی معرکہ آرائی اور انقلابی سرگرمیوں سے بھی غافل نہ تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ امام جعفر صادق کی اولاد میں کچھ نے مسلح قیام کی ابتداء کی اور ایسے زبردست انقلاب برپا کئے کہ ان مختصر اوراق میں ان کا تفصیلی بیان ممکن نہیں ہے۔

امام جعفر صادق کے عظیم کارنامے

امام جعفر صادق نے شیعیت کو خطرات سے محفوظ کیا اور اسلام کی اصل تعلیمات کو اس حد تک پھیلا دیا کہ صاحبان زرو ہوں اور اپنے زمانے کے بلعم باعوراؤں، قارونوں اور فرعونوں کے لئے اسلام کی صورت مخ کرنا یا اسلام کو اصلی شکل کی جگہ کسی دوسری نقلی صورت میں اتارنا ناممکن ہو گیا۔ اس عظیم کارنامہ میں امام جعفر صادق کی کاوشوں کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ شیعہ مذہب کو ”مذہب جعفری“ کہا جائے لگا۔ امام باقر کے زمانے تک شیعیت پیغام کی حالت میں تھی امام جعفر صادق نے اسے نظام کی منزل تک پہنچایا۔

امام جعفر صادق نے اپنی نظریات کو چار بہترین طریقوں سے پیش کیا:-

- (۱) شاگردوں کی تربیت
- (۲) پیغمبر اور ائمہ سلف کی احادیث کی روایت
- (۳) شیعہ فقہی نظام کی تدوین
- (۴) شیعوں کے اعتقادی اور کلامی روش کو روشن کرنا

علمی و فکری میدان میں امام جعفر صادق کے کارہائے نمایاں اس قدر عظمت اور اہمیت کے حامل ہیں کہ اسلام اور تمام دنیا کے صف اول کے مفکرین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ) نے، جو تاریخ اسلام میں ممتاز ترین دانشور شمار کیا جاتا ہے، کہتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد امام جعفر صادق سے بڑا دانشور اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔

امام جعفر صادق صرف شیعیت ہی کو ”نظام“ کی صورت میں نہیں لائے بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں فقہ کی تدوین کی کیونکہ سنیوں کے چاروں امام جو چار فقہوں کے بانی ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ ابو حنیفہ جو اہل سنت میں فقہ کے سب سے پہلے تدوین کنندہ ہیں امام جعفر صادق کے شاگردوں میں تھے۔ دو سال خدمت امامؑ سے استفادہ کرتے رہے اور وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ: ”لولا سنان لہلک النعمان“^(۱) یعنی ”اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان (ابو حنیفہ) ہلاک ہو جاتا۔“

ہمارے ائمہ خورشید جہاں تاب تھے جن کی بارگاہ سے اسلام کے تمام فرقوں حتیٰ کہ غیر مسلموں تک نے استفادہ کیا ہے۔ امام کے درس میں صرف اہل سنت کے فقہی و کلامی مکاتب کے بانی ہی نہیں بلکہ نصاریٰ اور صائبین کے دانشور تک حاضر ہوئے تھے۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کہتے ہیں:-

”مسلمان اور کافر سب بارگاہ امام جعفر صادق میں حاضر رہا کرتے تھے اور ان کے خوان

(۱) یہ جملہ اہلسنت کے برگزیدہ عالم عبدالحق نے شیعوں کی رد میں لکھی جانے والی ”تحفہ اثنا عشریہ“ میں نقل کیا ہے۔

فضل سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔“

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:-

”جب ہم مسلمان قوم کی تاریخ میں امام جعفر صادق کے دور کا ان کے پہلے کے دور سے مقابلہ کرتے ہیں تو بالکل نور اور ظلمت کا مقابلہ معلوم ہوتا ہے۔“^(۱)

امام جعفر صادق کی بارگاہ درس میں صرف ”منقولات“ ہی کی تدریس نہیں ہوتی تھی بلکہ ”تجرباتی علوم“ اور فلسفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ چھٹے امام نے صرف فقہ کی تدوین یا تفسیر وحدیث اور کلام ہی کو وسعت نہیں دی بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علوم طبعی (Natural Sciences)، ہیئت (Astronomy) اور طبیعیات (Physics) کو بھی وسیع پیمانے پر مرتب کیا۔ امام جعفر صادق سے پہلے امام محمد باقر نے بھی طبیعیات اور جغرافیہ کا درس دیا تھا مگر امام جعفر صادق نے ان علوم کو وسعت دی۔ اسٹریٹس برگ کی تحقیقاتی درس گاہ کے دانشور جو یورپ کے مشہور ماہرین اسلامیات ہیں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کوپرنکس کا زمین کے گردش کا نظریہ جو قرون آخر کے سائنسی مسلمات میں سمجھا جاتا ہے، اس سے ہزار سال قبل امام جعفر صادق نے سورج کے گرد زمین کی گردش کا اعلان کیا تھا جس سے پہلے کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے۔ پہلی بار امام جعفر صادق نے یہ اعلان کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ دن اور رات اسی روزانہ کی گردش کا نتیجہ ہیں۔ یورپی مفکر لکھتا ہے کہ: ”ان حالات میں صرف وہی ان حقائق کا سراغ پاسکتا تھا جو غیر معمولی عقل کا مالک ہو اور وہی بغیر کسی وسیلہ کے ایک ایسی حقیقت تک پہنچ سکتا تھا جس کا اظہار اس کے پہلے کسی نے نہ کیا ہو۔“^(۲)

وہ مغربی مفکر یہ کیا جانے کہ امام جعفر صادق کی ہستی وہ ہے جس کا براہ راست رابطہ آسمانی علم کے سرچشمہ سے ہے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو جی، الہام، علم وہی اور انبیاء اور ائمہ کی خصوصی

(۱) مغز متفکر جہان شیعہ، مرکز تحقیقاتی اسٹریٹس برگ، ص ۶۹ و ۷۰

(۲) مغز متفکر جہان شیعہ، ص ۹۵

قوتوں اور کرامتوں کا معتقد نہ ہو، اس امر کی توجیہ مشکل ہے کہ کپلر اور کوپرنیکس کے نظریات پیش کرنے کے کم و بیش ہزار سال قبل امام جعفر صادق نے یہ کس طرح بتا دیا کہ زمین گول ہے اور وہ آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے، وہ بھی ایسی صورت میں کہ اس دور کے قسطنطنیہ، اسکندریہ، انطاکیہ اور گندیسا پور جیسے علمی مراکز سے مدینہ دور تھا۔ ائمہ اور انبیاء اختیارات کے مالک کامل انسان ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تمام حقائق کو براہ راست بغیر کسی درمیانی پردہ کے دیکھ لیتے ہیں۔

وجی، الہام، اشراق و تعقل اور حسی تجربہ یہ سب کسب معرفت اور کشف حقیقت کے مختلف وسائل ہیں، مگر وجی اور الہام کے ذریعہ جو حقائق روشن ہوتے ہیں وہ پختہ ہوتے ہیں جبکہ تعقل و تجربہ کے وسیلہ سے حاصل ہونے والے حقائق ناقص اور رفتہ رفتہ حاصل ہوتے ہیں۔

اسٹریٹس برگ کی درس گاہ کے دانشور اس نتیجہ پر بھی پہنچتے ہیں کہ تاریخ انسانی میں امام جعفر صادق نے پہلی بار ارسطو کے طبیعیاتی نظریہ کے خلاف یہ بتایا تھا کہ مٹی اور ہوا خالص عناصر نہیں بلکہ دوسرے عناصر سے مرکب ہیں۔ اس زمانے بلکہ اس سے بھی سینکڑوں سال بعد تک عناصر رابعہ علم الاشیاء کے ارکان میں سے سمجھے جاتے تھے، بقول ایک یورپی محقق کے: ”امام جعفر صادق نے اٹھارویں صدی عیسوی کے علماء سے گیارہ سو برس قبل ہوا کے اجزاء کا انکشاف کیا اور بتایا کہ ہوا تنہا ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اور کئی عناصر کا مرکب ہے، ارسطو کے بعد تک کے دنیائے طبیعیات کے ممتاز ماہرین یہ نہیں جانتے تھے کہ ہوا کوئی عنصر (Element) نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں لاوازیہ کے دور تک اکثر دانشور ہوا کو ایک عنصر سمجھتے تھے۔ جب لاوازیہ نے ہوا میں موجود دیگر گیسوں سے آکسیجن کو الگ کیا اور ثابت کیا کہ آکسیجن سانس میں اور جلانے میں بہت بڑا اثر رکھتی ہے تو اس کے بعد سائنس دانوں کی اکثریت نے اس بات کو مانا کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے بلکہ چند گیسوں کا مرکب ہے، اس طرح امام جعفر صادق اپنے وقت سے گیارہ سو برس آگے تھے۔“^(۱)

(۱) مغز متفکر جہان شیعہ، ص ۶۰ و ۶۱

امام جعفر صادقؑ نے نہ صرف یہ انکشاف کیا کہ ہوا چند عناصر کا مرکب ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ ہوا میں موجود عناصر تنفس کے لئے ضروری ہیں۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں لاوازیہ کے آکسیجن کے انکشاف کے بعد بھی ہوا میں موجود دیگر گیسوں کو ہوا کے اعتبار سے بے فائدہ سمجھتے رہے اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں انہوں نے اپنے نظریہ کی اصلاح کی اور اس نکتہ پر متفق ہوئے کہ ہوا میں موجود دیگر گیسیں اگر آکسیجن کے ساتھ شامل نہ ہوتے تو تمام ذی روح کا پھیپھڑا جل جاتا اور ان کا وجود ختم ہو جاتا۔ لہذا آکسیجن کے ساتھ ہوا میں موجود دیگر گیسوں کی شمولیت بھی حیات کا لازمہ ہے۔ اس طرح بارہ سو برس بعد دنیائے علم نے امام جعفر صادقؑ کے قول کی تصدیق کی کہ ہوا میں موجود تمام گیس تنفس کے لئے ضروری ہیں۔^(۱)

اسی طرح چھٹے امام نے فرمایا کہ: ”ہم لوہے کو لکڑی کی طرح جلا سکتے ہیں۔“ آج ہم دیکھتے کہ لوہے کو اگر اس طرح گرم کیا جائے کہ وہ سرخ ہو جائے، اس کے بعد اسے خالص آکسیجن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں آگ لگ جاتی ہے، ایسا چراغ بن سکتا ہے جس کا فلیٹہ لوہے کا ہو۔ بہر حال لاوازیہ تک اس نکتہ پر نہیں پہنچ سکا تھا مگر امام جعفر صادقؑ نے لاوازیہ اور پریشی سے بھی بہتر آکسیجن کے خواص کو ان سے بہت پہلے بتا دیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ اہل بیتؑ جو علم وہی کے چشمہ لایزال سے سیراب ہوتے رہے ہیں نہ صرف انہوں نے مذہبی معنوی اور روحانی علوم پھیلانے میں بلکہ علم طبیعی، جغرافیہ اور دیگر علوم میں انسانیت کے لئے نئے افق کھول دیے۔ یہ عمل اسلام کی بصیرت اور جہاں بینی کا مظہر ہے، جو دین کو دنیا سے اور روح کو مادہ سے جدا اور بے ربط نہیں سمجھتا اور ”دین“، ”دانش“، ”علم“، ”مذہب“، ”الہام“، ”عقل“ اور ”تجربہ“ کے درمیان تضاد کا قائل نہیں ہے۔ ائمہ نے اپنے عمل کے ذریعہ اپنے پیروؤں پر یہ ظاہر کر دیا کہ صرف مذہبی میں ہی نہیں بلکہ طبیعی اور انسانی دانش کی قلمرو میں بھی تمام ملتوں اور قوموں کے آگے آگے چلنا چاہئے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر میدان میں

انسانیت کے لئے ”لیڈر“ اور نمونہ بن کر رہیں، اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں ”شہداء علی الناس“ یعنی انسانوں پر گواہ بنا کر پیدا کیا ہے اور ”شہاد“ وہ ہوتا ہے جو ممتاز حیثیت کا مالک ہو، چنانچہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر میدان میں یہاں تک کہ ٹیکنالوجی تک میں تمام قوموں میں ممتاز رہیں۔

شیعہ ائمہ متعدد جہات کے مالک تھے۔ وہ بے عیب انسان کامل تھے۔ ایک طرف تو وہ فکری کمالات کے مالک تھے اور دوسری طرف اخلاقی اور عملی کمالات کے ساتھ ربانی روحانی مدارج کے حامل بھی تھے۔ امام جعفر صادقؑ کو صرف شیعہ ہی خدائی رہبر اور معصوم نہیں مانتے ہیں بلکہ تمام غیر شیعہ مسلمان بھی روحانی مقامات کی حیثیت سے انہیں دنیا کے عرفا کا پیشوا مانتے ہیں۔ تمام عرفا کا سلسلہ امیر المومنینؑ پر ختم ہوتا ہے اور امام جعفر صادقؑ بھی جیسا کہ عرفاء کے اقطاب نے اقرار کیا ہے، مثلاً شیخ عطار نے ”تذکرۃ الاولیاء“ میں زنجشیری نے ”ربیع الابرار“ میں اور ابوالحسن خرقانی نے بھی اس کا اقرار کیا ہے کہ آپ دنیا کے عرفاء کے پیشوا تھے۔

مگر وہ عرفان جس کے پیشوا ہمارے امام تھے، وہ صوفیوں کے انحطاط پذیر عرفان سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارے ائمہ حقیقی اسلامی عرفان کے مظہر تھے۔ ایسا عرفان جو معاشرہ سے گریز اور وحدت الوجود کے متعلق نظریاتی تانہ بانہ بننے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ایسا عرفان ہے جس کی بنیاد توجیہ اسلامی اور وحدت پر ہے۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام ظلم و جور سے معرکہ کے علمبردار

آسمان ولایت کے ساتویں خورشید حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اکثر مورخوں کے قول کے مطابق، ۷ صفر ۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ امام موسیٰ کاظمؑ امام جعفر صادقؑ کے تیسرے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ مکرمہ برقوم کی ایک پرہیزگار خاتون تھیں۔

ساتویں امام کی امامت کا زمانہ خلافت منصور کا آخری دور تھا۔ آپ کا دور منصور کے بعد مہدی اور ہادی کے دور سے ہوتا ہوا ہارون الرشید کی خلافت کے تیرہ سال تک رہا۔

عباسیوں کو اگرچہ (ابو عباس) سفاح نے اقتدار تک پہنچایا مگر خلافت عباسیہ کا اصلی بانی منصور تھا۔ اس نے چالاک، سیاست بازی اور خوں آشامی کے ذریعہ عباسی اقتدار کو مستحکم کیا۔ منصور کے دور اقتدار میں زیادہ تر سادات اور علوی جو حکومت حق کے قیام کے لئے کھڑے تھے یا جو ائمہ اہل بیتؑ کے زیر اثر تھے شہید کر دئے گئے۔ البتہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں خود منصور شہر بغداد کو جدید پایہ تخت بنانے میں سرگرم تھا، اسی وجہ سے امام موسیٰ کاظمؑ کو علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا موقع مل گیا جس کی ابتدا امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کر گئے تھے۔ اس دور میں شیعوں اور تمام مسلمانوں کی علمی، فکری اور تہذیبی رہنمائی کا کام امام موسیٰ کاظمؑ کے ذمہ تھا کیونکہ ہر سیاسی اور انقلابی تحریک کے لئے پہلے نظریاتی اور فکری تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ دور شیعوں کے عقائد کی پر اکندگی کا بھی دور تھا۔ پہلے سے موجود کیسانی اور زیدی فرقوں کے علاوہ اب فرقتہ اسماعیلی اور عبد اللہ فتح کے پیروؤں کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے بہت زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ شیعوں کے بنیادی عقائد اور نظریات کی واضح تشریح اور توجیہ پیش کی

جائیں۔ اس طرح امام موسیٰ کاظمؑ کے ابتدائی دس برسوں کو نظریات کی وضاحت کا وہ دور سمجھنا چاہئے، جس کی ابتدا امام محمد باقرؑ کے دور سے ہوئی اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں جاری رہی۔

ائمہ کے مقابلے میں حکومت کے رویہ کے لحاظ سے اور امام کے کارناموں کے پیش نظر امام موسیٰ بن جعفرؑ کے دور کو منتقلی کا دور شمار کرنا چاہئے۔ شیعوں کو نسبتاً آزادی کا جو دور محض امویوں اور عباسیوں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے مل گیا تھا وہ امام محمد باقرؑ کے زمانہ سے شروع ہو کر امام صادقؑ کے زمانہ سے ہوتا ہوا امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ کے دس سال تک قائم رہا۔ اس دوران ائمہ نے شیعہ تہذیب کی ترویج کا کام کیا۔ اس کے بعد سے ظلم و استبداد اور سرکوبی کا دور شروع ہوا جس سے امام کاظمؑ، امام جوادؑ اور امام حسن عسکریؑ دوچار رہے۔ (امام رضاؑ کا دور ایک خاص خصوصیت کا حامل اور ایک مستثنیٰ دور سمجھا جاتا ہے)

نقوش کار کے لحاظ سے بھی امام موسیٰ بن جعفرؑ کا دور علمی فعالیت ”تدوین نظام“، نشر و اشاعت اور آگاہی سے سیاسی معرکہ کی طرف منتقلی کا دور ہے۔ تدوین ”نظام“ کے مرحلے کے بعد پھر اقدام کا مرحلہ آجاتا ہے اور شواہد بتاتے ہیں کہ امام کاظمؑ اس کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔ منصور کے بعد یکے بعد دیگرے مہدی، ہادی اور ہارون برسر اقتدار ہوئے۔ یہ زمانہ حقیقتاً خلافت عباسیہ کے اقتدار اور شیعوں اور علویوں کی سرکوبی اور ان پر ظلم و تشدد کے عروج کا تھا۔ اس دور میں بہت سی شیعہ تحریکیں شروع ہوئیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ فکری اور علمی فعالیت کے بعد سیاسی اقدامات کی تیاری فرما رہے تھے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی اور مفہوم و ابعاد امامت

شیعی نکتہ نظر سے امام یا انسان کامل ایسی ہستی ہوتا ہے جس نے خلیفہ الہی کے تمام روحانی، اخلاقی اور علمی صلاحیتوں کو روکاری بخشی ہے اور اس مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے کہ خلق کے لئے نمونہ اور رہبر اور فیض ربانی کا ذریعہ ہو۔ امام صفات عالیہ اور مقامات معنوی میں بہترین خلایق اور

سیاسی، اجتماعی اور فکری میدان میں ان کا رہبر اور پیشوا ہوتا ہے۔ وہ روح اسلام سے خمیر ہوتے ہیں اور اوپر کے سرچشمہ سے رابطہ رکھتے ہیں، عملاً الوہی نظام اسلام کے اجرا کرنے والے ہوتے ہیں۔ امام مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کے حامل ہوتے ہیں:

- (۱) سیاسی اور غیر سیاسی لحاظ سے عام رہبری
 - (۲) گفتار و رفتار سے علوم و معارف اسلامی کی تشریح، اشاعت اور عملی پیشکش اور دین کی حفاظت
 - (۳) روحانی کردار، امامت باطنی اور معاشرے کی روحانی اور اخلاقی پرورش
- شیعوں کے ساتویں پیشوا امام موسیٰ بن جعفرؑ بھی مندرجہ بالا اصولوں اور خصائص کا مجسمہ تھے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم امامت کے جہات اور مفاہیم کو نہ صرف فکری و تجریدی و نقشی لحاظ سے بلکہ امام کی حیات طیبہ میں، ان کی حیثیت جاگتی عملی پیکر کی صورت میں ایک مختصر جائزہ لیں گے۔
- امام کا وہبی علم**

امام کی خصوصیات میں ایک خصوصیت، وہبی علم ہے یعنی پیدائش کے وقت ہی سے امام خاص بلکہ، خاص صلاحیتوں کا اور ذمہ علم حضوری کا مالک ہوتا ہے۔ مدرسہ، مکتب اور اکتسابی علم کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک معصوم دوسرے معصوم سے اور اپنے پیشرو سے رموز علم و حکمت ربانی اور باطنی بلندیاں حاصل نہیں کرتا، جیسا کہ ائمہ نے مکرر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے مگر انہیں حالات میں امام فیضان الہی کے سرچشمہ سے براہ راست بھی سیراب ہوتا ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ بھی اس مفہوم کا عملی پیکر تھے۔ تاریخ و سیر کی کتابیں بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؑ جب کم سن تھے اس وقت اہل سنت کے حنفی مسلک کے پیشوا ابوحنیفہ سے ان کی گفتگو اور مناظرہ اس حقیقت کا ایک منہ بولتا گواہ ہے۔ سیرت نویسوں میں سے اکثر نے اس مناظرہ کو ابوحنیفہ کے قول سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”سفر حج کے موقع پر بعض اختلافی مسائل پر امام جعفر صادقؑ سے گفتگو کی غرض سے اور ان سے ملنے کے لئے مدینہ پہنچا۔ ملاقات کی اجازت

کے انتظار میں دلیز پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بچہ باہر آیا جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اگر کوئی مسافر رفع حاجت کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو کیا کرے؟ بچہ نے ایسا مفصل اور مدلل جواب دیا اور اس سلسلے میں اتنے واجبات، مستحبات اور مکروہات گنوائے کہ میں شرمندہ ہو گیا۔“

اس کے بعد حنفی مسلک کے امام ابوحنیفہ نے ایک پیچیدہ سوال کیا: ”گناہ کا سرچشمہ کیا ہے؟“ موسیٰ بن جعفرؑ نے جواب دیا: ”گناہ کا سرچشمہ یا خالق کی ذات ہو سکتی ہے یا مخلوق کا عمل یا دونوں کا اشتراک۔ اگر گناہ کا سرچشمہ خالق ہوتا تو اس کے لئے وہ بندوں کو سزا نہ دیتا۔ اگر گناہ کا سرچشمہ خالق و مخلوق کا مشترک ارادہ ہوتا تو بھی خالق کی ذمہ داری زیادہ تھی کیونکہ وہ زیادہ طاقت اور ارادے کا مالک ہے لہذا قوی تر ہو کر وہ ضعیف تر کو سزا نہ دیتا۔ اب اگر گناہ کا سرچشمہ خود مخلوق کا عمل ہو جیسا کہ ہے تو ایسی صورت میں اگر خداوند تعالیٰ اسے بخش دے تو اس کا کرم ہے اور اگر سزا دے تو اس کا انصاف ہے۔“

امام کی سیاسی رہبری

امام کا ایک کردار معاشرے کی سیاسی اور اجتماعی رہبری ہے۔ ساتویں امام موسیٰ بن جعفرؑ کا دور خلافت منصور کے آخری برسوں، خلافت ہادی کے مکمل دور اور خلافت ہارون کے تیرہ سال تک تھا۔ درحقیقت یہ دور خلافت عباسیہ کے عروج اور شیعوں اور علویوں کے لئے سرکوبی، جس اور ظلم و تشدد کا دور تھا۔ منصور کے دور اقتدار میں بیشتر سادات اور علوی جو حکومت حق کے قیام کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا جو معتزت کے زیر اثر تھے، بے رحمی کے ساتھ شہید کر دئے گئے تھے۔ امام نے اس زمانے میں حکومت کے خلاف جدوجہد کی درپردہ رہنمائی کی ہے۔ سادات اور علوی، جو تحریک کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ان میں شاید امام کے وجود نے جوش و ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ امام نے شہید سادات کے پس ماندگان کی دیکھ بھال اور مومنین کی رہنمائی کی۔ بنی عباس اسی وجہ

سے بہت زیادہ خوفزدہ تھے، ابن خلکان نے ”وفیات الاعیان“ میں لکھا ہے کہ خلیفہ عباسی مہدی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا: ”کیا مجھ کو تمہاری بغاوت سے امان مل سکتی ہے؟“۔ ”منتہی الامال“ (باب نہم، فصل پنجم) میں آیا ہے کہ ہارون نے امام موسیٰ بن جعفرؑ کے متعلق کہا کہ: ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا فتنہ نہ برپا ہو جائے کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔“ یہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ امام خاموشی سے امت کی رہبری کا کام انجام دیتے رہے اور حکومت کے انحراف اور ظلم و تشدد کے خلاف مقابلہ کے وسائل بھی بہم پہنچاتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہارون امام کو مدینہ سے بغداد کیوں لاتا اور سالہا سال قید تنہائی میں ان پر نظر کیوں رکھتا۔ حالانکہ ہارون امام کی منزلت سے واقف تھا مگر ان کی طرف سے اپنے اقتدار کے لئے سخت خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ کتاب ”مختصر اخبار الدول“ میں امام کے حالات کی شرح کے ضمن میں منقول ہے کہ مدینہ میں جب امام ہارون کے سامنے تشریف لائے تو ہارون نے غیر معمولی طور پر ان کا احترام کیا، جب آپ تشریف لے گئے تو مامون نے باپ سے پوچھا کہ ”یہ آدمی کون تھا؟“ ہارون نے جواب دیا: ”یہ تمہارے بچپن میں جنہیں تم نے آج دیکھا، یہ ہر شخص کے مقابلہ میں امامت اور پیشوائی کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن اگر میں دیکھوں گا کہ میرے خلاف کوئی تحریک اٹھا رہے ہیں تو میں انہیں ختم کر دوں گا۔“^(۱)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہارون اپنے تمام تر اقتدار و جبروت کے باوجود امام کی جانب سے ہمیشہ خائف اور ہراساں رہتا تھا۔ شیعوں کے ائمہ ظلم و ستم، انحراف، علیحدہ پسندی اور نفاق و کفر کی قوتوں کے خلاف معرکہ میں سب سے آگے تھے۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے صفوان بن یحییٰ سے فرمایا کہ: جو شخص کسی طرح بھی یہ چاہتا ہو کہ ظالم باقی رہیں تو وہ بھی ظالم ہے۔“

دو وجہ سے سربراہان حکومت ائمہ شیعہ سے بے حد خوفزدہ رہا کرتے تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے علمی منزلت اور فضیلت کی وجہ سے عوام کے محبوب تھے، ایسی حالت میں جب نیزہ و شمشیر اور زور و زور سب خلفاء کے اختیار میں تھا ائمہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور دوسری وجہ

اسلامی جہاد اور ائمہ کی سیاسی رہبری تھی۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہارون کے تاثرات ہمارے بیان کردہ نکات کے منظر ہیں۔ ایک طرف تو ہارون امام کے فضائل، مدارج علمی اور روحانی کمالات سے واقف تھا، جو امام سے کینہ اور خوف دشمنی کی ایک وجہ تھی دوسری طرف ساتویں امام کی معرکہ آرا انقلابی رہبری کی وجہ سے بہت خوفزدہ تھا۔

امامؑ کی علمی و فکری رہبری

علوم و معارف اسلام کی اشاعت اور مکتب اور نظریات کی حفاظت امام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ کے بعد امام موسیٰ بن جعفرؑ نے معارف اہل بیتؑ کی تدوین اور نشر و اشاعت کی عظیم تحریک کو پورا کرنے کی ذمہ داری ادا کی۔

جس دور میں امام موسیٰ کاظمؑ نے امت کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالی، وہ دنیائے اسلام میں غیر اسلامی افکار اور نظریات کے جہوم اور مختلف فلسفی اور کلامی مکاتب فکر کے ظہور کا دور تھا۔ ایک جانب ہندوستانی، مسیحی اور یونانی افکار خلل ڈال رہے تھے تو دوسری جانب زندیق، صوفی اور دہریہ جیسے دیرانی نظریات عروج پر تھے۔ امامؑ نے اسلام کی حقیقتوں اور اس کے علوم و معارف کی تشریح کے ذریعہ دین کے محاذ کی حفاظت کی۔ شیعہ فقہ و حدیث اور کلام کی کتابیں جو امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بیانون سے بھری پڑی ہیں اور اس سب سے زیادہ آسودہ علمی میراث میں سے ایک ہے جو ائمہ نے چھوڑی ہیں۔ ہشام بن حکم، یونس بن عبد الرحمن، صفوان بن یحییٰ، محمد بن ابی عمر، عبد اللہ بن المغیرہ، حسن بن محبوب السرا، احمد بن ابی نصر بن ظبی، معمر بن خلاف، عبد الرحمن بن بکلی، علی بن جعفر، اسحاق بن عمار صرغی، اسماعیل موسیٰ بن جعفر، حسین بن علی بن حصال، داود رقی، عبد السلام بن صالح حصروی، موسیٰ بن بکیر اور سیکڑوں برگزیدہ علماء و افاضل جنہوں نے علم الکلام، حدیث و فقہ کے میدان میں نئی نئی گہرائیاں اور وسعتیں پیدا کیں، یہ سب امام موسیٰ بن جعفرؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ان کے

امام کی معنوی و روحانی و عرفانی منزلت مختلف روایات سے ظاہر ہوتی ہے۔ ابن سعد یافعی کتاب ”روض الریحان“ میں شفیق بلخی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شفیق نے کہا: ”۱۴۹ھ میں حج کے سفر پر روانہ ہوا، قادیسیہ پہنچ کر ناگاہ اس کی نظر ایک خوبصورت نوجوان پر پڑی جو پیشینہ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ شفیق کہتا ہے: میں یہ سمجھا کہ وہ صوفیا میں سے کوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے بڑھاتا کہ اسے ملامت اور نصیحت کروں، مگر میں جونہی اس کے قریب پہنچا اس نے صریحی طور پر میرے نام سے مجھے مخاطب کیا اور کہا:

{اجْتَنِبُوا اكْثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثمٌ} یعنی سوءظن سے پرہیز کرو کہ اکثر ظن گناہ کا باعث ہوتا ہے۔“ میں غلٹ کے ساتھ اس کے پیچھے میں روانہ ہوا مگر اس تک نہ پہنچ سکا اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں واقعہ پہنچا۔ وہاں اس جوان کو نماز میں مشغول دیکھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچتا کہ وہ نماز ختم کر لے تو اپنے گمان کے لئے معافی مانگ لوں، لیکن نماز ختم کرتے ہی وہ اچانک میری طرف مڑا اور بولا: {وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا} (یہ قرآن کی ایک اور آیت ہے) جس کا مطلب ہے ”میں توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا اور ان گناہوں کو چھپانے والا ہوں“ جب منیٰ پہنچا تو اسے ڈول ہاتھ میں لئے کنوئیں کے پاس پایا۔ اچانک ڈول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کنوئیں میں جا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ یکبارگی اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا: ”انت ربی اذا طمئت الی الحاء وقوتی اذا اردت الطعام اللّٰهم انت تعلم یا الھی وسیدی مالی سواها فلا تعومنی ایاهاً“ ”اے خدا تو ہی میرا سب کچھ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔“ میں نے دیکھا کہ کنوئیں کا پانی ابل کر اوپری سطح تک آ گیا۔ آسانی سے پانی لینے کی صورت پیدا ہو گئی۔“^(۱) یہ واقعہ ائمہ کے ماورائی منزلت اور روحانیت کا مظہر ہے۔ شفیق اس واقعہ کے آخر میں اعتراف کرتا ہے کہ ”موئی بن جعفر عظیم القباب وابدال میں سے ایک تھے۔“ ساتویں امام کی زندگی کا ہر لمحہ ان کی منزلت و ولایت کا شارح رہا ہے۔

(۱) المجالس السنه، ج ۲ ص ۵۲، ارشاد، مفید، ص ۲۶۰ منقول از دورنمایی، زندگانی امام موسی بن جعفر

185

ربانی علم سے فیضیاب ہوئے تھے۔
صدر المتألمین ملا صدرا حدیث عقل کی شرح میں جو امام موسیٰ کاظمؑ نے ہشام ابن حکم سے بیان کی تھی، لکھتے ہیں: ”یہ حدیث ایسی خصوصیات عقل کی حامل ہے کہ دوسرے صاحبان نظر دانشور اور عرفا کی کتابوں کی کئی جلدیں بھی اس کے مماثل نہیں ہو سکیں۔ اس حدیث کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں ماوراء طبیعات، فلکیات، نفسیات، علم الاخلاق اور تمدنی سیاست کے متعلق اشارات و مواعظ، پند و نصائح اور حیات آخرت کی توجیہ کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔“ (۱)

مصری اہلسنت فاضل ڈاکٹر محمد موسیٰ کتاب ”الفقہ الاسلامی“ میں لکھتے ہیں: ”وہ پہلے شخص جنہوں نے فقہ میں مرتب کتاب چھوڑی، امام موسیٰ بن جعفرؑ تھے، جنہوں نے ۱۸۳ھ میں زندان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔“ (۲) یہ تمام باتیں ان حقائق کا مظہر ہیں کہ کس طرح ایک امام ظلم و ستم اور رختیوں کے پر آشوب دور میں بھی مکمل دین اسلام کی ہمہ گیری کا تحفظ، اس کی شرح اور اس کے افکار و عقائد کی نگرانی کرتا ہے۔

امام کی روحانی منزلت

امام انسانوں کے لئے فیض ربانی کا ایک وسیلہ ہے۔ وہ احساسات سے ماورا اور باطنی آفاق میں بھی پرواز رکھتا ہے اور ولایت کی حقیقت کا حامل ہوتا ہے۔ امام کو عام انسانی پیمانہ سے نہیں جانچا جاسکتا ہے امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی بھی اسی ماورائی حقیقت کا سرچشمہ تھی حتیٰ کہ شہادت کے بعد بھی فیضان امام جاری رہا۔ اسی وجہ سے اسلام کے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے کاظمین میں امام موسیٰ کاظمؑ کی بارگاہ کا نام ”باب الحوائج“ رکھا ہے یعنی وہاں ہر شخص کی آرزوؤں کی تکمیل منجانب اللہ ہو جاتی ہے۔

(۱) دورنمایی از زندگانی امام موسیٰ بن جعفر، ص ۲۸

(۲) الفقه الاسلامی، مدخل لدرایہ نظام المعاملات فیہ، ص ۱۶۰

امام رضا علیہ السلام

مامون کی سیاست کا تجزیہ — امام رضاؑ اور ان کا طریقہ کار

ائمہِ عمرت چونکہ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر دور کے لئے نمونہ ہیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے انہیں ہر طرح کے حالات سے دوچار رکھا تا کہ ہر حالت میں ان کا کردار، طریقہ کار اور حکمت عملی آئندہ نسلوں کے لئے ایک نمونہ جاوید رہے۔ لہذا اس تابناک سلسلہٴ عصمت کی ہر فرد خاص قسم کے مختلف حالات سے دوچار رہی اور مختلف قسم کے حالات میں حق کی پاسداری، حقیقت کے تحفظ، ”پیغام“ کی تبلیغ و ترویج اور اس کی چارہ سازی (Tactics) اور اسٹریٹجی کے لئے مخصوص طریقہ کار کا انتخاب کیا۔ ائمہ کے رکھ رکھاؤ کو سمجھنے اور ان سے اپنی رہنمائی پانے کے لئے ہمیں چاہئے کہ دشمن کے حالات، اسلوب اور اسٹریٹجی کے مقابلے میں اپنے ائمہ کی حکمت عملی کا تجزیہ کریں۔

ائمہٴ عصمت کے درمیان جن حالات سے امام رضاؑ دوچار رہے، وہ انتہائی قابل غور ہیں۔ کیونکہ ایک طرف ”مکر“ باطل علمبردار ہے اور دوسری طرف ”مکاری کے جواب“ کار ہر برحق۔

مامون کی چال

مامون امام رضاؑ کو جو ”اقدار اسلامی“ کے علمبردار ہیں اپنا ولی عہد کیوں نامزد کرتا ہے اور یہ حکم جاری کرتا ہے کہ خلافت عباسیہ کے زیر نگین تمام قلمرو میں واعظین امام رضاؑ کے نام کا خطبہ پڑھا کریں؟ مامون امام رضاؑ کو کیوں مدینہ سے بلوا کر اپنی ولیعہدی کی پیش کش کرتا ہے اور کیوں انہیں سخت مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں؟

پہلا نکتہ جو ہم اس اقدام سے سمجھ سکتے ہیں، وہ امامؑ کے اثرات اور ان کے سماجی سیاسی کردار کی اہمیت ہے، کیونکہ مامون، جو دنیا میں سب سے بڑا صاحب اقتدار بادشاہ تھا، جب تک امامؑ

کے سیاسی سماجی اور جنگی توانائی کے وزن کو سمجھ نہ لیتا، امامؑ کے آگے، جن کو وہ اپنے نظام کا دشمن سمجھتا تھا، ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔ ناممکن تھا کہ مامون ایک گوشہ نشین شخص کو، جو سیاست سے بے تعلق تھا مدینہ کی گلی کے ایک گھر کے کسی گوشہ میں یا مسجد نبوی میں وعظ یا روحانی و معنوی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو، مدینہ سے پایہ تخت میں بلوائے اور اسے اپنے نظام خلافت کا دشمن سمجھتے ہوئے بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس عمل سے مامون کی نیت کیا تھی؟

اس زمانے کے سرکاری مورخوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مامون کا یہ فعل حق پرستی اور انصاف کا نتیجہ تھا۔ مثلاً طبری لکھتا ہے کہ ”امام رضاؑ کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون کا منشا یہ تھا کہ: اِنَّهُ نَظَرَ فِيْ بَنِي الْعَبَّاسِ وَبَنِي عَلِيٍّ فَلَمْ يَجِدْ أَحَدًا هُوَ أَفْضَلُ وَلَا أَوْعَى وَلَا أَعْلَمُ مِنْهُ۔ (مامون نے دیکھا کہ بنی عباس اور اولاد علیؑ میں امام رضاؑ سے بڑھ کر متقی اور صاحب علم کوئی نہیں ہے۔^(۱) یعقوبی اور ابن اثیر اسی نظریہ کو دوہراتے ہیں۔^(۲)

اصفہانی بھی یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مامون صدق نیت سے عہدہٴ خلافت امام رضاؑ کے نام منتقل کرنا چاہتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں، مامون کے ساتھ امین کی خوں آشام جنگ کے دوران مامون نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ فتیاب ہو جائے گا تو خلافت کو اولاد علیؑ کی افضل ترین فرد کے نام منتقل کر دے گا۔ چونکہ امام رضاؑ سب سے افضل تھے، اس لئے مامون نے خلافت ان کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔^(۳)

فخری بھی مؤرخین کے اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو مامون کے اس فیصلہ کو صدق نیت پر محمول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

إِنَّ الْمَأْمُونُ فَكَّرَ فِي حَالِ الْخِلَافَةِ بَعْدَهُ وَارَادَ أَنْ يَجْعَلَهَا فِي رَجُلٍ يَصْلَحُ

(۱) طبری، ج ۷ ص ۱۳۵

(۲) ملاحظہ ہو: ابن اثیر، الکامل، ج ۱ ص ۱۱۱، یعقوبی، ج ۳ ص ۱۷۶

(۳) مقاتل الطالبيين

بِهَٰلِ الْفِتْرِ اِيْ ذِمَّتِهٖ كَذَٰلِكَ عَمَّ^(۱)

مگر حقیقت یہ ہے کہ مجموعی مقاصد اور عمومی مفادات کے لحاظ سے مامون میں اور دیگر خلفاء میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ہوس کا بندہ اور صاحب قوت و ثروت تھا اور اس کا آخری مقصد ذاتی اقتدار کا استحکام تھا اور اس معاملہ میں اس نے اپنے بھائی کے قتل سے بھی گریز نہ کیا۔

امام رضاؑ کو اپنا ولیعهد اور خلیفہ نامزد کرنا بھی، اپنے اقتدار کے استحکام اور اپنے دشمنوں کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ شیعہ مفکرین نے ہمیشہ اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے کہ مامون کا یہ فیصلہ صدق نیت پر مبنی تھا اور یہ واضح کیا ہے کہ مامون کا یہ اقدام صرف سیاسی مصلحت کی بنیاد پر تھا۔^(۲) مورخین کا وہ گروہ جو مامون کے اس فیصلہ کو ایک صادقانہ فیصلہ بتاتا ہے، ان کا مقصد مامون کو انصاف پسند اور حق دوست ظاہر کرنا ہے۔ ان کی کوشش مامون ہی کے منصوبے اور اسٹریٹیجی کا حصہ ہے۔ مقاصد کے اعتبار سے مامون اور دیگر خلفاء میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب اقتدار کے دیوانے تھے۔ گرد و باتوں میں وہ اپنے خلفائے سلف و خلف سے مختلف تھا۔

اولاً یہ کہ مامون دوسرے تمام خلفاء کے مقابلے میں بہت زیادہ چالاک تھا، اور اس لحاظ سے اسے عباسی معاویہ کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح امیر معاویہ نے حکومت کے لئے طاقت کو سفارتکاری (Diplomacy) سے ملا دیا تھا، اسی طرح مامون بھی طاقت کے ساتھ سیاست کو استعمال کرنے کے فن میں ماہر تھا۔ وہ کہیں زیادہ چالاک تھا کہ طاقت کو اقتدار کے استحکام کا واحد ذریعہ سمجھتا، بلکہ ڈپلومیسی، سیاست اور اچھوتا سیاسی تدبیر (Tactics) اپنانے کی طرف بھی اس کا رخ تھا۔ اسی طریقے سے اس نے عرب عمائدین اور عباسیوں کی مخالفت اور امین کا چھوٹا بھائی ہونے کے باوجود، امین کو راستے سے ہٹا دیا اور خود خلافت پر قبضہ کر لیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مامون

(۱) الفخری، ص ۱۹۸

(۲) مثال کے لئے دیکھیں: رضا مظفر: تباری الشیعہ معروف بہ عقیدۃ الشیعہ الامامیہ، ص ۱۶۱

علامہ طباطبائی: شیعہ در اسلام و علامہ سید علی نقی: زندگانی اماماں (رہنمایاں اسلام) حصہ ۸ (پاکستان ایڈیشن)

دوسرے اموی اور عباسی خلفاء کے مقابلے میں نسبتاً اچھا علمی فکری اور ثقافتی ذوق رکھتا تھا اور اپنا ظاہر ایسا بنائے رکھتا تھا۔ گویا وہ علم و فضیلت کا دوستدار اور حق و انصاف کا طرف دار ہے۔ صاحب فخری اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”كَانَ الْمَأْمُونُ مِنْ أَفْضَلِ خُلَفَائِهِمْ-----وَكَانَ فَطْنًا شَدِيدًا“^(۱) (یعنی ”مامون دوسرے عباسی خلفاء سے زیادہ چالاک تھا۔“)

سیوطی کہتے ہیں: ”كَانَ أَفْضَلُ رِجَالِ بَنِي الْعَبَّاسِ حَزْمًا-----وَعِلْمًا وَرَهْبًا“^(۲)

مامون کی چالاکي، علم اور سیاست یہ وہ دواہم باتیں تھیں جو حکومت میں اس کی قوت اور قریب کی آمیزش کا سبب بنیں۔

مامون کا مقصد —

’طاقت‘ کو ’اقتدار‘ میں اور ’فرمان‘ کو ’شرع‘ میں بدلنا

مامون جو دوسرے خلفاء کے مقابلے میں زیادہ چالاک تھا یہ نکتہ سمجھ چکا تھا کہ ’طاقت‘ و ’اقتدار‘ اور ’حکومت‘ اور ’شرعی حیثیت‘ میں کیا فرق ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ”حکومت“ عوام کی نظروں میں ’شرعی حیثیت‘ سے محروم ہو تو وہ ’طاقت‘ ہوتی ہے، اقتدار نہیں اور وہ ہمیشہ متزلزل اور خطرات میں گھری رہتی ہے۔ شرعی حیثیت کے بغیر ’طاقت‘، ’اقتدار‘ (عمرانیاتی اصطلاح کا) میں نہیں بدلتا۔

عباسیوں نے امویوں سے جنگ کے دوران اپنی تحریک کی ’شرعی حیثیت‘ کو پیغمبرؐ و آل پیغمبرؐ سے انتساب کے ذریعے حاصل کیا تھا اور امام حسینؑ کے انتقام کے نام پر اپنی اموی مخالف تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ

(۱) الفخری، ص ۱۹۷ (۲) تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۶

اقتدار کو اصل حق دار یعنی آل محمدؑ کے سپرد کر دیں گے، مگر اموی حکومت کے زوال کے بعد عنان حکومت خود ہی سنبھال لی اور پچھلے نعرے بھول گئے۔ اسی وجہ سے عراق، خراسان اور فارس کے عوام کی نگاہوں میں جو آل محمدؑ اور ائمہ اہلبیتؑ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے، ان کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی اور امویوں کی طرح شمار کئے جانے لگے۔

مامون کی غالباً یہ خواہش تھی کہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کا جال پھیلا کر ”طاقت“ کو ”اقتدار“ میں تبدیل کرے اور ”حاکمیت“ کو عوام کی نظر میں ”جائز“ بنادے۔ وہ امام رضاؑ کو اپنے سماجی اور سیاسی نظام کی توجیہ کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن امامت نے اپنے نپے تلے اور ربانی عمل اور حکمت کے ذریعہ اس طاغوتی منصوبہ پر پانی پھیر دیا اور ولی عہدی کو توجیہ نظام کا وسیلہ بننے کے بجائے اسی نظام کو کچل ڈالنے کے اسلحے میں تبدیل کر دیا۔

دوسرا مقصد — عوام کی نظر میں حکومت کی ’ساکھ‘ کو بدلنا

مامون اپنے اس اقدام کے ذریعے عوام کی نظر میں خلافتی نظام کی ساکھ کو بدلنا چاہتا تھا۔ امویوں کے دور سے خصوصاً یزید کے زمانے سے حکومت میں ایک عجیب وحشی پن، درندگی (بربریت)، اور تمدن کشی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد سفاح، منصور اور ہارون کی خون آشامیاں اور درندگی اس کیفیت کے باقی رہنے کا باعث ہوئی۔ اس پر امین و مامون کی خانہ جنگی نے اس ’ساکھ‘ کو بدلنے میں کوئی مدد نہ کی۔

مامون چونکہ چالاک کے لحاظ سے تمام سابق خلفاء سے مختلف تھا، اس لئے وہ حکومت کے بارے میں اس عام تاثر کو بدل دینا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک طرف تو اس نے خود کو علم دوست ظاہر کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود کو حق و فضیلت کا طرف دار ثابت کرنا چاہا۔ چنانچہ اپنے پہلے مقصد کو پورا کرنے کی خاطر اس نے قدیم علمی مآخذ کی اشاعت، اور حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کے ترجموں، علمی مناظروں اور فلسفیانہ نشستوں کا سلسلہ شروع کیا اور دوسرے

مقصد کی تکمیل کے لئے اہلبیتؑ کے فضائل کا اقرار خصوصاً امیر المومنینؑ کے مرتبہ کا اعتراف، سادات کا احترام اور امام رضاؑ کی ولی عہدی کا اعلان کیا تا کہ اسے حق پسند سمجھا جانے لگے۔ یہ دونوں اقدام مامون کی ایک ہی پالیسی کے دو پہلو ہیں جن کا مقصد حکومت کے لئے شرعی حیثیت عوامی اور مقبولیت پیدا کرنا اور حکومتی نظام کی ساکھ کو بدلنا تھا۔

تیسرا مقصد — ابھرتی ہوئی شیعہ تحریک کو دبانا

اس دور میں شیعیت ایک عوامی انقلابی قوت کی صورت میں ابھر آئی تھی اور شیعہ نظام حاکم کے خلاف حزب مخالف کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں بالخصوص خراسان میں انقلاب کا آتش فشاں تیار تھا اور لاوا پھوٹنے ہی والا تھا۔ مامون امام رضاؑ کی ولی عہدی کے اعلان سے اس آتش فشاں کو سرد کرنا چاہتا تھا، لاوے کو پھوٹنے سے روکنا چاہتا تھا، انقلابیوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنا اور تحریک میں پھوٹ ڈالنا چاہتا تھا اور تحریک کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر امام رضاؑ کی حکمت عملی نے تحریک کو اور زیادہ پھیلا دیا۔

شیعہ عربی مصنف ہاشم معروف اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لکھتا ہے کہ: ”جب مامون نے دیکھا کہ شیعہ اثرات پھیلنے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ اس کے ارکان دولت میں بھی شیعہ ائمہ اور شیعیت کی طرف جھکاؤ پایا جانے لگا ہے، تو اس نے اس کا سد باب کرنا چاہا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کا اعلان شیعہ تحریک کو پھیلنے سے روکنے کی ایک چال تھی۔ ایک طرف وہ تحریک کی آگ کے سرد ہونے کا منتظر تھا، دوسری طرف انقلابیوں کے رہبر کو پایہ تخت میں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔“^(۱)

۳۲ھ سے یعنی جب سے عباسی برسر اقتدار آئے، مختلف شیعہ انقلابات کا ایک تسلسل سا قائم ہو گیا، یہاں تک کہ بعض وزراء بھی شیعہ رجحانات رکھتے تھے اور خلافت کو بنی فاطمہ کی طرف منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ (ابی سلمہ انحلال نے ابی عباس سفاح کے دور میں اور یعقوب بن داؤد نے

(۱) سید ہاشم معروف، عقیدۃ الشیعہ الامامیہ، ص ۱۶۱

المہدی کے دور میں ایسی ہی جدوجہد کی۔ امین اور مامون کے دور میں بھی بڑی بڑی شیعہ تحریکیں ہوئیں۔ محمد بن ابراہیم اور ابی السرایا کے انقلابات یا محمد دیاج بن امام جعفر صادق کا قیام ایسا ہی ہے۔ دراصل شیعہ تحریکیں اور انقلابات مامون کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اس دور میں ہر دور سے زیادہ شیعوں کی جدوجہد وسیع اور انقلاب کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ مامون کے لشکر کا سپہ سالار طاہر بن حسن خود شیعہ خیالات کا حامل تھا۔

امام رضا کی ولی عہدی سے مامون یہ چاہتا تھا کہ اس بہانے سے شیعوں کو جنھوں نے ایک حزب مخالف کی شکل میں مقابلہ کا نقشہ بنا رکھا ہے ان کو مورچوں سے باہر کھینچ کر (اس) مقابلہ کا خاتمہ کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ امام کے انقلابی مقام و منزلت پر کاری ضرب لگائے اور شیعوں کی امکانی (Potential) انقلابی طاقت کو دبا دے۔ اس زمانے تک شیعہ ہمیشہ ایک مخالف قوت اور محاذی عنصر سمجھے جاتے تھے جو پہاڑوں اور دروں میں مورچہ بندی کرتے تھے۔ مامون امام رضا کو ولیعہدی قبول کرنے پر اس لئے مجبور کر رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ مقابلہ پر ایک ضرب لگائے جس نے حکومت سے پل بھر کا چین بھی چھین لیا تھا۔ مگر امام رضا نے اپنی رہبری کی خداداد استعداد کی بنا پر اس کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تحریک کو اور پھیلا دیا حتیٰ کہ مامون امام کو شہید کر دینے پر بزعیم خود مجبور ہو گیا۔

چوتھا مقصد — امام کی شخصیت کو توڑنا

حکومت کا مقصد امام کے انقلابی شخصیت پر ضرب لگانا تھا۔ امام کی شخصیت کو کمزور کرنے کے لئے مامون نے دوسرے طریقے اور تدبیریں بھی آزمائیں مثلاً علم کلام کے چند تجربہ کار ماہروں کے ساتھ امام کے مناظرے کرانا تاکہ امام کبھی شکست کھا جائیں اور ان کی علمی وقعت مجروح ہو جائے، لیکن ہر مناظرہ میں امام کی شخصیت اور بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی۔

پانچواں مقصد —

داخلی دشمنوں کے خلاف اقتدار کی جنگ میں شیعہ طاقت کا استعمال

یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ امام رضا کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون ایک تیر سے دو ٹکڑا کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف شیعوں کے انقلابی رجحانات کو قابو میں رکھنا اور دوسری طرف اس عظیم قوت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا۔ ابھی تک مامون کے اقتدار کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں اور عرب عمائدین مامون کے مقابلے میں امین کے طرفدار تھے اور مامون اقتدار کے مرکز کو عرب عمائدین کی طرف سے بدل کر اہل خراسان کی طرف کر دینے کی کوشش میں تھا۔ اہلبیت سے ظاہری دوستی محض اس خیال سے تھی کہ شاید اس طرح ایرانی عوام اس کے حامی ہو جائیں۔ امام رضا کی ولی عہدی کے اعلان سے انقلابی شیعوں کی عظیم قوت کو وہ اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اور اہل خراسان کی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا جو زیادہ تر شیعہ رجحانات رکھتے تھے اور جن کی مدد سے اپنے داخلی دشمنوں کو شکست دے سکا تھا۔ عرب کے عوام چونکہ امین کے طرفدار تھے لہذا اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فارس اور خراسان کے عوام پر بھروسہ کرے۔

چھٹا مقصد — خراسان کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنا

امام رضا کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون کا ایک اور مقصد خراسان والوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا، یہاں تک کہ امین کی شکست کے بعد بھی وہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے سلسلے میں خراسان والوں ہی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کی ماں جس کا نام مراجل تھا خود بھی خراسان ہی کی رہنے والی تھی۔ امین اور مامون کی خونی خانہ جنگی درحقیقت عرب اور فارس و خراسان والوں کے بیچ کھینچا تانی تھی۔ مامون کا وزیر فضل بن سہل ایرانی تھا اور امین کا وزیر فضل بن ربیع عرب تھا۔ اقتدار بچانے کے لئے مجبوراً مامون زیادہ تر ایرانیوں اور خراسانیوں پر بھروسہ کرتا تھا۔^(۱) چونکہ اکثر خراسانی شیعہ رجحانات رکھتے تھے،

اس وجہ سے ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مامون مجبوراً خود کو اہلبیت کا دوست ظاہر کرتا تھا۔

شہادت امام رضاؑ — مامون کی اسٹریٹیجی کی ناکامی

امام رضاؑ کی ولیعہدی کے سلسلہ میں مامون کا اقدام، عباسی نمک خوار مورخین کے نظریے کے برخلاف، مخلصانہ نہ تھا بلکہ یہ اقدام قطعی سیاسی اور ریاکارانہ تھا، مگر امامؑ نے خدا داد حکمت عملی کے ذریعہ مامون کے نقشہ کو نقش بر آب بنا دیا۔

امامؑ نے مختلف طریقے اور اظہار کراہت کے ذریعہ مامون کو اس کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ ولیعہدی کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے سچے پیغام، شیعیت کی تبلیغ، حکومت اور موجودہ نظام کو پابند بنانے کا کام کیا۔ امامؑ کے اسی عظیم کارنامے نے مامون اور حکومت کو اس درجہ خوفزدہ کر دیا کہ بالآخر گھبراہٹ کے عالم میں مامون نے انہیں زہر دلو کر شہید کر دیا۔ امام رضاؑ کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حکمت عملی کے مقابلے میں مامون کی چال مات کھا گئی۔ خلیفہ نے امامؑ کو زہر دے کر اپنی کمزوری اور بے چارگی کا اعتراف کیا ہے۔

مَكْرُوزًا وَمَكْرُؤًا لِّلّٰهِ وَاللّٰهُ خَبِيرُ الْمَاكِرِيْنَ۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی

مامون اور اس کی خلافت کی اسٹریٹیجی کے مقابلے میں امامؑ کی حکمت عملی کیا تھی؟ امام رضاؑ کی حکمت عملی بالکل نئی، بے حد حساس اور بہت زیادہ قابل غور ہے۔ حکمت عملی پوری طرح تازہ اور نئی ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے شیعہ ائمہ مقابلہ کو بڑھانے کی غرض سے ہمیشہ دار الخلافہ سے دور رہتے تھے مگر امام رضاؑ نے مجبوراً ولیعہدی قبول کی اور دار الخلافہ میں رہ کر مقابلہ کو آگے بڑھایا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی بے حد حساس ہے، اس لئے کہ انقلابی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے دار الخلافہ سے دور رہنا، ولیعہدی قبول کر لینے سے زیادہ آسان تھا، لیکن امام رضاؑ نے تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ولیعہدی کو ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔

یہ حکمت عملی بے حد قابل توجہ ہے کیوں کہ حق و باطل کی کشمکش میں طرح طرح کی تدبیریں اور مختلف طریقہ کار استعمال ہوا کرتے ہیں۔ کبھی ’قعود‘ یعنی بیٹھنے (صلح حسن) اور کبھی قیام یعنی اٹھنے (جہاد حسینی) سے نبرد آزما کی گئی، کبھی خطابت (حضرت زینبؑ) سے کام لیا گیا، کبھی دعا (سید سجادؑ) اور کبھی نشر علوم اور نظریاتی کام (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ) کبھی قید و بند (امام موسیٰ کاظمؑ) اور کبھی مسند ولیعہدی (امام علی رضاؑ) کے ذریعہ تحریک کے سچے رہبروں نے مقابلہ کیا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی اس وجہ سے بھی بے حد قابل غور ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خدائی رہبر کس طرح بدترین حالات میں اپنی خواہش کے خلاف جبریہ ولیعہدی قبول کر کے بوجہ احسن اس ولیعہدی سے تحریک کے لئے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

امام رضاؑ نے اس قسم کی حکمت عملی کا انتخاب کیوں کیا؟ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس زمانے کے اسلامی معاشرے کا جائزہ لینا چاہئے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد ”معیار“، ”مقدار“ پر قربان ہو چکا تھا۔ اسلام تیزی کے ساتھ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں پھیل چکا تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد مسلمان ہو گئے تھے مگر ان میں زیادتی ایسے افراد کی تھی جو نام کے لئے تو مسلمان ضرور ہو گئے تھے مگر عملاً وہ دور جاہلیت کے عقائد اور تہذیب کے پابند تھے۔ اگر کسی حد تک اسلام سے آشنا بھی تھے تو یہ وہ اسلام تھا جو انہیں دربار خلافت سے ملا تھا۔ حجاز، کوفہ، بصرہ اور یمن کے عوام یعنی دنیا کے اسلام کے مرکز کے لوگ کسی حد تک اسلام سے واقفیت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے شیعہ تحریکوں کی ابتدا ان ہی علاقوں سے ہوئی تھی۔ مگر ترکستان، ماوراء النہر، روم، افریقہ، یورپ (اندلس) اور سندھ وغیرہ کے عوام اسلام کی صحیح تعلیمات، ائمہ کی منزلت اور شیعہ تحریک سے تقریباً بے بہرہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خلفائے عباسیہ نے شیعہ تحریک کو تاتاریوں، ترکوں اور رومیوں کی مدد سے کچلا ہے۔

نسبتاً منصف اور ذمہ دار دانشور جو قلبِ دنیا کے مرکزی خطہ (حجاز، بغداد، دمشق) کے رہنے والے تھے حکومت کے مخالف تھے، اور ائمہ اہلبیتؑ کی طرف رجحان رکھتے تھے (یہاں تک کہ ائمہ اہلسنت یعنی ابوحنیفہ، شافعی اور مالک نے بھی حکومت کے کارندوں کے ہاتھوں

دڑے کھائے اور قید کی سختیاں جھیلیں۔ حکومت کے پالے ہوئے سرکاری علماء کا کام موجودہ نظام حکومت کی توجیہ پیش کرنا ہوتا تھا۔ جو اسلام ترکستان اور تفتاز کے لوگوں تک پہنچا تھا وہ فیلینو رانیوں کے ذریعہ پہنچا تھا۔

واقف کار علماء اور عوام تو ائمہ کو روحانی اور حقیقی پیشوا کی حیثیت سے سمجھتے تھے جب کہ حکومت کو غیر شرعی سمجھتے تھے لیکن ناواقف اور دور دراز علاقوں میں بسنے والے افراد حکومت کی قدغن اور غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے ائمہ کی معرفت نہیں رکھتے تھے۔ صرف حجاز، مدینہ اور کچھ عراق و ایران کے محدود علاقوں میں پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ کی یاد دلوں میں باقی رہ گئی تھی۔ علماء کے درمیان امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ کا ذکر نمایاں طور پر ہوتا تھا۔ بقیہ عوام یعنی بلخ سے لے کر اندلس تک کے رہنے والے حکومت کی افواہوں اور ریشہ دانیوں کی وجہ سے اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ رسولؐ کے گھرانے پر کیا گذر رہی ہے۔ خصوصاً امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانے میں جو خلیفہ کی قید میں تھے، رسولؐ کے گھرانے اور تشیع کے اور عوام کے درمیان رابطہ بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ان ہی حالات میں امام رضاؑ نے امامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور مامون نے ان پر ولیمعہدی لاد دی۔ اور انھیں اسے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ایسی حالت میں اگر حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود امامؑ یہ تہیہ کر لیتے کہ وہ اس پیش کش کو ٹھکرا دیں گے تو زیادہ سے زیادہ وہ شہید ہو جاتے جو علیؑ اور حسینؑ کے وارثوں کے لئے افتخار کی بات تھی، اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا، تاہم بادل ناخواستہ اس پیش کش کو منظور کر لیا تاکہ اسی ذریعہ سے اماموں کے نام اور شیعیت کا پیغام عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ امامؑ چاہتے تھے کہ حکومت کی ضرورت کو ”برج فریاد“ کے طور پر تشبیہ کی نقابت کا ذریعہ بنالیں اور اسی مقام سے شیعیت کی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچا دیں۔

امام حسینؑ نے اپنے خون، حضرت زینبؑ نے اپنی خطابت اور سید سجادؑ نے اپنی دعاؤں سے شیعہ تحریک کو اس حد تک محکم بنادیا تھا کہ اب اس کے وجود کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے شیعہ علوم کو مسلک کی شکل میں مدون کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ولی عہدی

کی پیش کش کو قبول کر لینے سے شیعہ مسلک کی غلط تفسیر کا کوئی احتمال باقی نہ رہا۔ چنانچہ امام رضاؑ نے اپنے اس عمل کے ذریعہ اس تحریک کو پھیلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

امام رضاؑ کی ولی عہدی کی بناء پر پہلی بار عالم اسلام کے تمام مساجد میں ایک خدائی رہبر اور امام اہلبیتؑ کا پیغام خطبہ میں شامل ہوا اور پہلی مرتبہ دنیائے اسلام کے سرحدی علاقوں میں رہنے والوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ پیغمبرؐ کے خاندان کی ممتاز ہستیاں ابھی موجود ہیں اور اس درجہ فضیلت کی مالک ہیں کہ خلیفہ تک انہیں عالم اسلام کی رہبری کے لئے لائق ترین فرد مان لینے پر مجبور ہے۔ امام رضاؑ نے شیعیت کو رسمی حکومت کے مقابلے میں ایک عظیم سیاسی قوت کی شکل بخشی۔ امام رضاؑ کے لئے ولی عہدی اپنے پیغام کی نشر و اشاعت کا اور دنیا کے کانوں تک حق کی آواز پہنچانے کا ایک ذریعہ تھی۔

مامون نے خود کو امامؑ کا طرفدار ظاہر کرنے کے لئے احکامات جاری کر دیئے کہ تمام مملکت اسلامی کی مساجد میں جمعہ کے خطبہ میں امامؑ کا نام شامل کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے حکومت کا قومی رنگ سیاہ کے بجائے سبز قرار دے دیا، کیوں کہ سیاہ رنگ بنی عباس کا قومی نشان تھا اور سبز رنگ بنی فاطمہ کا۔ جشیاری لکھتا ہے:

”وَ كَانَ الْمَأْمُونُ قَدْ جَدَّ فِي تَجْدِيدِ الْعَهْدِ لِعَلَى الرَّضَا عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَقُومُ إِلَى الْفَضْلِ بِأَخِيهِ بِأَخِيهِ الْبَيْعَةِ عَلَى النَّاسِ وَالْكِتَابَةِ إِلَى الْإِقْلِيمِ فِي أَبْطَالِ السَّوَادِ وَ كَتَبَ الْفَضْلُ إِلَى أَخِيهِ الْحَسَنِ تَغْلِيمَهُ بِذَلِكَ وَيَأْمُرُهُ بِتَرْكِ السَّوَادِ وَأَنْ يَلْبَسَ الْخَضِرَةَ وَيَجْعَلَ الْأَعْلَامَ وَالْفَلَانِسَ الْخَضِرَاءَ وَيَطَالِبَ النَّاسَ بِذَلِكَ وَ كَاتَبَ فِيهِ جَمِيعَ عَمَلِهِ۔“

اس طرح امامؑ کے نام اور شیعہ تحریک کے پیغام کی توسیع ہوئی۔ جس ہتھیار کو مامون نے امامؑ کے خلاف اور شیعہ تحریک کو بیکار کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا، امامؑ نے اسی ہتھیار کو خلافت اور حکومت کے خلاف استعمال کیا اور مجبوری کے باعث جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان ہی حالات سے امامؑ نے شیعہ تحریک کے مفاد میں استعمال کیا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک طرف تو ولی عہدی قبول کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ خلافت کو

وہ اپنا حق سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف بار بار مختلف طریقوں سے اس بات کو ظاہر کیا کہ مامون اور اس کی حکومت کے مخالف ہیں اور وہ ولی عہدی کو مجبوراً قبول کر رہے ہیں۔ امام رضا اسی قسم کے حالات سے گذر رہے تھے جن سے تیسرے خلیفہ کے قتل کے بعد حضرت علیؑ گذرے تھے۔ حضرت علیؑ نے بھی خلافت قبول کر لی تھی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اگر علیؑ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے تو انہوں نے خلافت قبول کیوں نہ کی؟ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ مجبوراً خلافت قبول کر رہے ہیں۔

امام رضاؑ جانتے تھے کہ ان کا ولی عہد بننا مامون کی توقعات کے خلاف ثابت ہوگا اور ان کی ولی عہدی سے شیعہ تحریک ختم نہیں ہوگی کیوں کہ شیعہ وہ مومن ہیں جو امامؑ کی عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امامؑ کبھی حکومت کے آلہ کار نہیں بنیں گے اور ولی عہدی کو قبول کرنے کا مقصد، نظام خلافت کو باطل قرار دینا ہے۔ امام رضاؑ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ وہ مامون کو یہاں تک ہراساں کر دیں گے کہ وہ انہیں شہید کر دے۔ اس طرح ولی عہدی کا قبول کرنا حکومت اور شیعوں کے درمیان مخالفت بڑھانے کا سبب ہو جائے گا، نہ کہ کم کرنے کا۔

امام رضاؑ نے اپنی حکمت عملی سے مامون کی حکمت عملی کو شکست دے دی اور ولی عہدی کو ایک ایسا ’منبر‘ بنایا جہاں سے وہ شیعہ احتجاج کو عالم اسلام کے گوشے گوشے تک پہنچا سکیں۔ ہم امام رضاؑ کی غیر معمولی حکمت عملی کی کامیابی کو اس ردِ عمل سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بعد مملکت اسلامی کے طول و عرض میں مختلف شیعہ انقلابی تحریکیں ابھرنے لگیں اور حکومت اس قدر ہراساں ہو گئی کہ بعد کے ائمہ کو ہمیشہ یا تو قید میں رکھا گیا یا کڑی نگرانی میں رکھا اور متوکل جیسے لوگوں نے دجلہ و فرات کو بے شمار شیعوں کے خون سے رنگین کر دیا۔

جس طرح امام حسنؑ کی حکمت عملی نے حکومت کے کریہہ چہرہ سے منافقت کی نقاب نوچ پھینکی اور ’معاویہ‘ یزید میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح امام رضاؑ نے بھی منافق حکومت کے چہرے سے اسلام دوستی کا نقاب نوچ پھینکا تھا اور مامون کو متوکل کے روپ میں اپنا اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا تھا کیوں کہ حق اور حق پرستوں کے لئے ’معاویہ‘ اور ’مامون‘ کا مرحلہ ہمیشہ ’یزید‘ اور ’متوکل‘ کے مرحلہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

امام محمد تقی -

تاجدار تقویٰ

آپ کا نام محمد بن علیؑ ہے مگر امام جوادؑ یا امام تقیؑ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ آپ کو ’ابو جعفر ثانی‘ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ آسمان ولایت و امامت کے نویں درخشاں ستارے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ نے اپنی امامت کا آغاز نو سال کی عمر مبارک میں کیا۔

ایک شبہ کا جواب

یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان نو سال کی عمر میں وہ امت کی روحانی، تہذیبی اور سیاسی رہبری کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں؟

اس سوال کے جواب میں ہمیں امامت کے عرفانی اور ماورائے طبیعیاتی ابعاد (Metaphysical Dimensions) پر نظر رکھنا ہوگا۔ ائمہ اور انبیاء فیض خداوندی کی تجلی ہوتے ہیں جو خداوند تعالیٰ کے مخصوص الطاف سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ خالق کائنات اور قادر مطلق کے عنایات خصوصی سے امام پیدائش کے وقت ہی سے خصوصی ملکہ، غیر معمولی روحانی استعداد اور علم حضوری کا حامل ہوتا ہے۔ امام اور نبی چونکہ مستقل طور سے براہ راست علم الہی اور اس کے مخصوص عنایت کے چشمہ سے فیضیاب ہوتے ہیں، اس لئے ’’علم وہی‘‘ کے مالک ہوتے ہیں اور حواس خمسہ اور (فطری) تربیت کے علاوہ دوسرے ذریعوں سے تحصیل نہیں کرتے۔ ان کا مقابلہ عام انسانوں کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جو شخص آفتاب کی روشنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے وہ اس بارے میں ’خبر‘، ’اطلاع‘، ’اکتساب‘ یا ’تحصیل علمی‘ کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر ائمہ میں

سے کوئی امام نو سال کی کمسنی میں ہی امامت کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے تو اس میں تعجب کی مطلقاً کوئی بات نہیں ہے۔

قرآن کریم حضرت عیسیٰ کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ گہوارہ میں بھی نبی تھے اور انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان خود ان الفاظ میں کیا تھا:

{ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا } (مریم/۳۰) (میں خدا کا بندہ ہوں

اور مجھے کتاب اور نبوت عطا ہوئی ہے۔)

ائمہ بھی اسی صنف سے ہوتے ہیں، اس لئے کم از کم کسی مسلمان کو یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آنا چاہئے کہ امام محمد تقیؑ نو سال کی عمر میں عہدہ امامت پر کس طرح فائز ہو گئے۔

ہمارے بارہ اماموں میں امام جوادؑ نے عمر کے لحاظ سے اس دنیا میں سب سے کم زندہ رہے۔ جب انہیں زہر دیا گیا، اس وقت ان کی عمر صرف پچیس برس تھی (۱۹۵ھ سے ۲۲۰ھ تک) مگر یہ زندگی جس قدر بھی ہے، ایک ”قوت“ ہے ایک ”طاقت“ ہے۔ اس کا راز (زندگی کے) ’معیار‘ میں ہے نہ کہ ’مقدار‘ میں۔ کیونکہ اس کا پیمانہ ’کتنے سال زندہ رہے‘ نہیں ہے بلکہ ’کیسے زندگی گزاری‘ ہے۔ کسی نے امام جوادؑ کی طرح سے مختصر ہی زندگی گزاری ہو مگر معیار اور تاثیر کے لحاظ سے لاکھوں انسانوں کی سالہا سال کی زندگی سے کہیں زیادہ ہو۔^(۱)

امام محمد تقیؑ کا دور مختصر ہونے کے باوجود نہایت تلامذہ خیز لیکن شہر آفر تھا۔ نویں امام کا دور ۲۰۳ھ سے ۲۲۰ھ تک ہے۔ اس وقت جبر و استبداد کا دور دورہ تھا جو شیعوں کی نسبتاً آزادی کے دور کے بعد شروع ہوا۔

اس زمانے کے سیاسی حالات

اس زمانے میں شیعہ دنیائے اسلام میں سب سے بڑی انقلابی طاقت اور حکومت وقت

(۱) زندگی امامان از آیت اللہ علامہ علی نقی، ص ۱۸۹

کے لئے بڑا خطرہ سمجھے جاتے تھے اور لاکھوں عوام میں ائمہ اہل بیتؑ کی مقبولیت حکومت کو خوفزدہ کر رہی تھی۔

امام جوادؑ کی امامت سے چند سال قبل عراق میں شیعوں کی زبردست تحریک کی ابتدا ہوئی۔ جمادی الثانی ۱۹۹ھ کے اواخر میں سادات حسینی میں سے، محمد بن ابراہیم نے جو ابن طباطبایہ کے نام سے مشہور ہیں، کوفہ میں ایک زبردست انقلاب کی رہبری کی۔ یہ لوگ ۱۹۹ھ کے ماہ رجب میں اس قدر مضبوط اور منظم ہو گئے تھے کہ زہیر بن مسیب کی سرکردگی میں حکومت کی جو فوج ان کے دبانے کے لئے گئی تھی، اسے ان لوگوں نے بری طرح مار بھگایا۔^(۱) ۲۰۰ھ میں سرزمین حجاز پر محمد دیاج بن امام جعفر صادقؑ کی سرکردگی میں شیعوں نے انقلاب برپا کیا اور تھوڑے عرصے تک اس علاقہ پر اپنی حکومت قائم رکھی۔ ۲۰۲ھ میں کوفہ میں ایک دوسری ہمہ گیر تحریک ابھری جس کی رہبری ابی سراہا کے بھائی عبداللہ کر رہے تھے۔ اس تحریک کے پشت پناہ بھی شیعہ ہی تھے^(۲) ان کی معنوی رہبری کے فرائض علی بن محمد بن امام جعفر صادقؑ انجام دے رہے تھے۔

یمن میں بھی شیعہ تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ ۲۰۰ھ میں ابراہیم بن امام موسیٰ کاظمؑ نے زبردست انقلاب برپا کیا اور پورے یمن میں علویوں کی حکومت قائم کر دی۔^(۳) ۲۰۸ھ میں عبدالرحمن بن احمد علوی کی سرکردگی میں ایک اور تحریک ابھر آئی۔

یہ تمام تحریکیں اور انقلابات بتاتے ہیں کہ شیعہ قوی ترین انقلابی طاقت اور حکمرانوں کی مطلق العنانی کے لئے زبردست خطرہ تھے۔

خلافت عباسیہ کو اچھی طرح علم تھا کہ امام رضاؑ اور امام جوادؑ مسلمانوں میں بے حد مقبول اور محبوب ہیں۔

تاریخ میں بہت سے شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمزور عوام کی بڑی

(۱) ملاحظہ ہو: ابن اثیر، الکامل ج ۶ ص ۸۲ و ۸۳ / طبری، ج ۷ ص ۱۱۷ / الاصفہانی، مقاتل الطالیین، ص ۵۲۸

(۲) طبری، ج ۷ ص ۱۴۴ (۳) طبری، ج ۷ ص ۱۱۷ / الاصفہانی، مقاتل الطالیین، ص ۵۲۵

اکثریت کی ہمدردیاں پورے عالم اسلام میں شیعہ ائمہ اور شیعیت کے ساتھ تھیں۔ طبری نقل کرتا ہے کہ حسین بن حسن جو علوی انقلابیوں میں تھے اور ”والی“ کے نام سے مشہور تھے، حج کے زمانے میں جب مکہ آئے تو میں نے دیکھا کہ خلافت عباسیہ کے گورنر داؤد بن عیسیٰ نے پہلے تو ان سے جنگ کا ارادہ کیا مگر پھر اس خیال سے باز آگیا۔ بقول طبری وہ ڈر گیا کہ حج کے زمانے میں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں اگر وہ ایسا کرتا ہے تو سارے کے سارے مسلمان شیعہ سردار کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے ”وَحْشِي أَنْ قَاتَلَهُمْ أَنْ يَمِيلَ أَكْثَرُ النَّاسِ مَعَهُمْ“^(۱)

یہ ایک تاریخی گواہ ہے جو وضاحت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ خلافت عباسیہ اس بات سے آگاہ تھی کہ عوام کی اکثریت شیعوں کی حامی تھی۔

ان حالات میں شیعہ انقلابی قوت اور عوام میں ائمہ اہلبیت کی محبوبیت کے پیش نظر مامون مجبور تھا کہ امام رضا کو اپنا ولی عہد مقرر کرے اور یہ اعلان کرے کہ ہم سیاسی اقتدار اس کے صحیح حقدار یعنی ائمہ اہل بیت کی جانب منتقل کر رہے ہیں۔ امام رضا کی ولی عہدی ۲۰ھ میں عمل میں آئی۔ درحقیقت مامون کا عمل ایک طرف تو شیعہ تحریک و انقلاب کے خلاف دفاعی چال تھی، دوسری طرف ائمہ کی مقبولیت سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا تھا مگر امام رضا کی ولی عہدی سے حکومت پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ شیعوں کی ہر دل عزیز و سیاسی اور عوامی قوت بڑھتی جا رہی ہے اور سیاسی نکتہ نظر سے شیعہ جو پہلے کی بہ نسبت اسلامی معاشرہ کے قوی ترین عنصر بن چکے تھے، امام رضا کی ولی عہدی کے بل بوتے پر کسی وقت بھی اقتدار پر قبضہ جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے امام رضا کو زہر دلویا اور تین اماموں کو یکے بعد دیگرے یعنی امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری کو زندان کے قید و بند، حراست اور مستقل نگرانی میں زندگی گزارنا پڑی۔ مامون کی سیاسی روش کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قوت سے زیادہ ”فریب اور یا کاری“ پر بھروسہ کرتا تھا۔

امام جواد کے مقابلے میں مامون کی تکنیکی چال

امام رضا کی شہادت کے بعد، امام جواد کے مقابلے میں مامون نے سہ رخنی چال اختیار کی۔ اولاً امام سے اپنائی و سببی تعلق ظاہر کر کے ان کی مقبولیت اور محبوبیت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اسی سیاست نے اپنی بیٹی ”ام الفضل“ کا عقد امام جواد سے کرنے پر اکسایا۔ مامون کا یہ اقدام امام رضا کے سماجی اقتدار اور عوامی اثر و نفوذ کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ مامون جیسا صاحب اقتدار خلیفہ عوامی قدر و منزلت پانے کی خاطر امام سے سببی قرابت ظاہر کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مامون کی دوسری سیاست یہ تھی کہ وہ برابر امام کو اپنی نظروں کے سامنے بطور قیدی رکھنا چاہتا تھا تا کہ ان کی حرکات و سکنات پر پابندیاں عائد رکھے اور وہ اپنے عوامی اثر و نفوذ اور مقبولیت کے سہارے حکومت کے خلاف کوئی انقلاب برپا نہ کر سکیں اور جیسا کہ کتابوں میں آیا ہے امام محمد تقی کو اپنی دامادی میں لینے کا مامون کا ارادہ سلامتی کے لحاظ کا کوئی اقدام بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا تھا کہ گھر کے اندر بھی امام پر کڑی نظر رکھی جائے۔ امام جواد کا عمر بھر اس طرح حکومت کی کڑی نگرانی میں رہنا اس بات کا شاہد ہے کہ عباسیوں کو امام کے اثرات سے بہت زیادہ خوف و ہراس تھا۔ تیسری بات، مامون امام کی روحانی شبیہ کو مسخ کرنے کی کوشش میں تھا تا کہ عوام میں ان کا اثر اور مقبولیت کم ہو جائے۔ امام محمد تقی کی امامت کے آغاز میں مامون نے دربار میں جو زبردست علماء اور دانشوروں سے مناظرے کرائے کہ امام کو علم الکلام، فقہ اور فلسفہ کے مشکل مسائل میں پھنسا یا جائے۔ زبردست ماہروں سے امام کا مقابلہ کرایا۔ مامون کو امید تھی کہ امام جواد جو عمر کے لحاظ سے کم سن تھے، ان تجربہ کار اور پیشہ ور مناظرہ بازوں سے شکست کھا جائیں گے اور حکومت ان کی شکست کو ان کی کم علمی اور فکری کوتاہی کے طور پر مشہور کر کے ان کی عوامی قدر و منزلت کے انحطاط سے فائدہ اٹھالے گی۔ اس طرح اسی سلسلے کے ایک تاریخی مناظرے میں مامون نے بیچی

بن ائیم کو آمادہ کیا کہ وہ امام سے سخت قسم کے سوالات کرے مگر وہ امام کے منطقی استدلال کے سامنے بے بس ہو گیا۔ مامون اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ وہ خدائی رہبر ہیں اور ملکوئی علم کے سرچشمہ سے براہ راست فیض حاصل کرتے ہیں۔

مامون کی موت کے بعد معتصم کے برسر اقتدار آتے ہی امام پر حکومت کی سختی اور دباؤ میں اضافہ ہو گیا۔ مامون نے فریب و ریا کو ترجیح دینا تھا مگر معتصم طاقت استعمال کرنے کا قائل تھا۔ اسی لئے اس کے زمانے میں شیعوں پر قید و بند، ظلم و جور اور ان کے قتل و خون میں اضافہ ہو گیا۔ معتصم کی ہی سازش کے نتیجے میں ام الفضل نے ۲۲۰ھ میں امام کو زہر دے کر شہید کر دیا۔^(۱)

امام علی نقی -

متوکل سے مقابلہ کے سورا

دسویں امام کا اسم گرامی ”علی“، کنیت ”ابوالحسن“ اور لقب ”نقی“ اور ”ہادی“ تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۲۱۴ھ میں مدینہ میں ہوئی۔ آپ کے سر مبارک پر صرف چھ برس تک امام جواد کی شفقت پداری کا سایہ رہا۔ امام جواد کی عراق جلاوطنی اور آپ کی شہادت کے بعد امت کی رہبری کی عظیم ذمہ داری کا بار آپ ہی کے دوش مبارک پر آن پڑا۔^(۱)

معتصم کی خلافت کے زمانے میں آپ کی امامت کا دور شروع ہوا۔ ۲۲۸ھ میں معتصم کی موت ہوئی۔ اس کے بعد واثق باللہ تخت نشین ہوا۔ اس کی موت کے بعد خلفائے عباسیہ کا سب سے بڑا ظالم اور جابر خلیفہ متوکل برسر اقتدار آیا۔ وہ ننگ زمانہ ۲۵۰ھ تک زندہ رہا۔ امام کے مقابلے میں حکومت کی چال متوکل کے تاریک دور میں عریاں ہو کر سامنے آئی۔

امام ہادی کا دور امام جواد کے زمانہ کی توسیع ہے، زمانہ نیز نتائج اور حالات کے لحاظ سے اس سے مشابہ ہے۔ متوکل کے برسر اقتدار آتے ہی عباسی حکومت کا ظلم و استبداد اپنے بام عروج پر پہنچ گیا۔ شیعوں کو جو عباسیوں کے ظلم و ستم اور فساد کے مقابلے پر ایک مورچہ تیار کئے ہوئے تھے، حکومت نے ختم کر دینے کا ارادہ کیا۔ شیعہ بھی عباسی سامراج کو متزلزل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے تھے، یہاں تک کہ متوکل کے دور سے قبل ۲۱۹ھ میں محمد بن قاسم بن عمر بن علی بن ابی طالب نے آخری اور سب سے بڑا شیعہ انقلاب برپا کیا۔ محمد بن قاسم کا انقلاب ”رقہ“ کے علاقہ سے شروع ہوا۔ چالیس ہزار جنگ آزما شیعہ ان کے ہمراہ تھے۔ محمد بن قاسم نے اپنا مرکز

(۱) امام علی نقی کے زمانے کے حالات، مجاہدات کی تفصیلی جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو: امام ہادی و نہضت علویوں از محمد رسول دریائی، طبع رسالت قلم ناصر خسرو، تہران

(۱) مرحوم کلینی، اصول کافی، ص ۲۹۳ / مرحوم مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۲ ص ۷۸

خراساں میں ”مرؤ“ کے قریب کوہ حریر کے قلعہ حصیہ میں منتقل کیا۔ پھر اس کے بعد طالقان کو اپنا مرکز بنالیا۔^(۱) انہوں نے طالقان ہی کو اپنا مستقر بنالیا اور ایرانی علاقوں کے لوگ ان سے منسلک ہو گئے۔ خلیفہ معتمد نے حسین بن نوح کی سرکردگی میں انقلابیوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں بھیجیں۔ مگر سامراجی فوجیں انقلابی مسلمانوں کی قوت ایمان سے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں اور ایک خونریز جنگ میں بری طرح شکست کھا کر تتر بتر ہو گئیں۔ اس کے بعد کی جنگوں میں، نوح بن حیان بن جبلہ اور ابن طاہر، حاکم شہر کی سرکردگی میں بھیجی گئی سامراجی فوجوں کو بھی شیعہ انقلابیوں نے شکست دے دی۔^(۲) چند مہینوں تک پورے علاقے پر شیعہ انقلابیوں کا مکمل قبضہ رہا۔ اس کے بعد بے اندازہ دشواریوں اور زحمتوں کا سامنا کرنے کے بعد عباسی حکومت انقلابیوں کی سرکوبی اور قائد انقلاب پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی۔

ظلم و استبداد، فساد اور انحراف کے خلاف شیعوں کے متواتر اور مسلسل مقابلہ کو فطری (بلکہ سیاسی قہر کے) طور پر عباسی حکومت نے ائمہ شیعہ کو اپنی سخت نگرانی میں رکھنے، انہیں قید میں ڈال دینے اور ان پر زیادہ سے زیادہ ظلم و تشدد کرنے کا بہانہ بنالیا۔

تاریخی شواہد کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام جوادؑ کی شہادت کے بعد عباسی حکومت امام ہادیؑ سے جو مسلمانوں کی روحانی فکری اور اجتماعی رہبری کا فرض انجام دے رہے تھے بے حد ہراساں تھی۔ تاریخی تحریروں میں منقول ہے کہ حرین (مکہ و مدینہ) کے سرکاری پیش امام نے حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے متوکل کو لکھا:

”اگر تمہیں مکہ و مدینہ کی ضرورت ہے تو علی بن محمد (ہادی) کو اس علاقے سے ہٹالے جاؤ کیونکہ انھوں نے اس علاقہ کے بیشتر لوگوں کو اپنی اطاعت اور اثر میں لے رکھا ہے۔“

دوسرے مقامات سے بھی عباسی سامراجی مشینری کے کارندوں نے خلیفہ کو امام ہادیؑ کے

(۱) ملاحظہ ہو: اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۵۷، ابن اثیر، الکامل، ج ۲، ص ۱۰۱، بعد تک

(۲) طبری، ج ۷، ص ۲۲۳ و ۲۲۴

بارے میں اسی قسم کی اطلاعات بھیجیں جو ائمہؑ کی عوام میں محبوبیت اور مقبولیت کی مظہر ہیں۔ اس زمانہ میں جب قصر بغداد میں رہنے والا خلیفہ دنیا کی سب سے زبردست طاقت سمجھا جاتا تھا، اس کا اقتدار دار الحکومت کے علاقوں تک محدود تھا اور اس کے مقابلے میں مسجد النبی میں بیٹھنے والا اور جناب فاطمہؑ کے مٹی کے گھر میں رہنے والا عوام کی اکثریت کے دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔ دوسرے اس سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ ائمہ امت روحانی و فکری رہبری کے فرض کی انجام دہی اور اسلامی تہذیب کی ترویج کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی معرکوں سے بھی غافل نہیں تھے۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تمام قلمرو اسلامی کے شیعہ انقلابی ائمہؑ ہی سے تحریک حاصل کرتے اور اپنے رہبر کے رابطہ میں رہتے۔ اس مسئلہ نے حکومت کو اس حد تک اپنی طرف متوجہ کیا کہ اسے اپنی عافیت اور اپنا وجود خطرے میں محسوس ہونے لگا اور مکہ و مدینہ ہاتھ سے جاتا ہوا نظر آنے لگا۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے امام ہادیؑ کو جلاوطن کر کے سامرا کے محلہ عسکر میں حکومت کے کارندوں کی نگرانی میں بیس سال تک قید رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اقدام کا سبب عوام میں امام کے اثرات، ان کی مقبولیت، ان کا مجاہدانہ کردار تھا۔

حکومت کو امام ہادیؑ کو اپنی نگرانی میں رکھنا بزمِ خود بجا تھا کیونکہ امام کی مقبولیت عوام میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ دار الخلافہ کے بہتیرے مقامات کے لوگ امام ہادیؑ کی روحانیت کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ثبوت کے طور پر ہم اس واقعے کو نقل کرتے ہیں: متوکل نے یحییٰ بن ہرئمہ کو مدینہ سے امام کو سامرا لانے پر مامور کیا تھا۔ چنانچہ یحییٰ بن ہرئمہ کہتا ہے کہ

”جب میں بغداد آیا تو والی بغداد اسحاق بن ابراہیم طاہری نے

مجھ سے سفارش کی کہ اگر علی ابن محمد ثقی کی خانہ تلاشی کے موقع پر تمہیں کچھ

نظر آیا ہو تو متوکل سے نہ کہنا اور سامرا میں بھی متوکل کے آدمی وصیف ترکی

نے ان کے حق میں سفارش کی، اس بات سے مجھے سخت تعجب ہوا۔“

تاریخی اسناد سے ظاہر ہوتا ہے کہ دار الخلافہ کے کارندے تک امام کے حامی ہو گئے

تھے۔ انہی مسائل نے حکومت کو امام سے اس قدر خوفزدہ کر دیا تھا کہ متوکل نے بیس برس تک اپنی خصوصی نگرانی میں رکھنے کے بعد زہر دے کر انہیں شہید کر دیا۔



حضرت امام حسن عسکری -

کی حیات اور ان کے کارہائے نمایاں پر ایک نظر

دسویں امام حضرت علی نقیؑ کے فرزند ارجمند حضرت امام حسن عسکریؑ کی ولادت باسعادت ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کا اسم مبارک ”حسن“ اور کنیت ”ابو محمد“ تھی چونکہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سامراء کے نزدیک ”عسکر“ نامی چھاؤنی میں قیدی کی حیثیت سے بسر ہوا، اس لئے آپ عسکری کے لقب سے مشہور ہوئے۔

امام کی زندگی کے ابتدائی گیارہ سال والد بزرگوار کے ساتھ مدینہ میں گذرے۔ اس کے بعد حکومت نے امام نقیؑ کو مدینہ چھوڑنے پر اور عراق جانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ امام حسن عسکریؑ بھی اپنے والد گرامی کے ہمراہ تمام شہزادوں و مصائب برداشت کرتے ہوئے سامراء پہنچے۔ سامراء میں امام علی نقیؑ جس تنہائی کی جگہ اور زنداں میں مقید تھے امام حسن عسکریؑ بھی وہیں آپ کے ساتھ تھے۔ امامؑ نے تمام حقائق، علوم و معارف اپنے پدر عالی قدر سے حاصل کئے۔ ۲۵۳ھ میں امام علی نقیؑ کی شہادت کے بعد ۲۲ برس کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ امام علی نقیؑ نے اپنی شہادت سے چھ ماہ قبل اپنے اصحاب و اقرباء کے درمیان آپ کی امامت کا اعلان فرما دیا تھا۔

زمانہ امام کے سیاسی حالات

جب امامؑ نے بار امامت سنبھالا، اس وقت عباسی خلیفہ معتز باللہ برسر اقتدار تھا۔ معتز کے معزول ہونے کے بعد مہندی باللہ نے گیارہ مہینے حکومت کی، پھر وہ بھی معتز کے ذریعہ ہٹا دیا گیا۔ اگرچہ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب عباسی حکومت سخت داخلی کشمکش اور بد حالی کی سختیاں جھیل رہی تھی۔ پھر بھی ’سرمایہ دارانہ جنگ میں ملوث یہ سارے گروہ حقیقی اسلام اور اس کے سچے رہنماؤں کے خلاف متحد

تھے۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد حکومت نے ائمہ مذہب حقہ پر دباؤ، پابندی شدید نگرانی اور غیر معمولی سختیوں کو معمول بنا رکھا تھا۔ یہ نگرانی ’نظر بندی‘ اور سختی امام یازدہم پر کئی گنا زیادہ تھی۔ اور یہ اس لئے تھا کہ اس دور میں رسول اللہ کی یہ حدیث لوگوں کے زبان زد تھی کہ ”گیارہویں امام کا فرزند ظالم حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔ اور دنیا میں حق و عدالت کا نظام قائم کرے گا۔“ یہی وجہ تھی کہ عنان حکومت جس کے ہاتھوں میں بھی ہوتی تھی وہ امام عسکریؑ کو قید خانہ میں رکھتا تھا۔ عباسی حکمران جانتے تھے کہ مسلمانوں کے واقعی رہبر اور پیغمبر کے حقیقی جانشین یہی حضرات ائمہ ہیں۔ امام حسن عسکریؑ جانشینان برحق کے سلسلے کی گیارہویں کڑی ہیں کہ جن کے بعد ہی مہدی موعود کا عہد شروع ہونا ہے۔ اسی بناء پر یہ لوگ گیارہویں امام کو ایک لمحہ کے لئے بھی آزاد چھوڑنے اور نگرانی میں کمی کرنے پر تیار نہیں تھے اور حضرت کو برابر چھاؤنی (عسکر) میں رکھتے تھے۔ صرف جب صاحبان اقتدار تبدیل ہوتے تھے تو اس دوران معمولی سی آزادی (وہ بھی شدید سرکاری نگرانی کے ساتھ) حاصل ہوتی تھی۔ جیسے ہی نیا حاکم حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا، حضرت کو دوبارہ قید کر لیا جاتا تھا۔ معتمد کے زمانے میں امام اور ان کے شیعوں پر ظلم و ستم اور نگرانی اپنے شباب پر تھی باوجود ان نامساعد حالات اور مصائب کے امام ہمیشہ فرائض ہدایت و امامت کو انجام دیتے رہے۔ جس وقت امام عسکریؑ قید میں تھے اس وقت امت اور امام کے درمیان رابطہ کے لئے نمائندے معین کئے تھے لیکن ان پر بھی ہر وقت حکومت کے سلامتی ذمہ داروں کی بھرپور نظر رہتی تھی اور کبھی کبھی تو ان امور کی نمائندگی کی انجام دہی کے لئے نمائندوں کو سیاسی، سماجی اور مذہبی امور انجام دینے کے لئے طرح طرح کے پوشیدہ انداز اختیار کرنا پڑتے تھے مثلاً جناب عثمان بن سعید اور ان کے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان جو امام کے مخصوص نمائندے تھے انہوں نے بغداد میں دوکان کھولی تاکہ ان سے ملنے والوں پر حکومت شک نہ کرے یہ عرصہ تاریخ میں اختیار کئے گئے شیعہ مجاہدوں اور حکیمانہ تدبیر (Tactics) میں سے ایک مثال ہے۔ اس طرح اموی اور عباسی حکومت کے سختی اور کسک بھرے ماحول میں ائمہ معصومینؑ کے زیر ہدایت پیام حق کے چراغ کو روشن رکھا گیا۔ امام

کے نمائندوں نے جو طرح طرح کے فرائض انجام دیئے ہیں ان میں شیعہ سیاسی انقلاب کی رہبری، رہنمائی، سماجی مسائل، اجتماعی میں رہنمائی، تحصیل خمس، اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور امام و امت کے درمیان رابطہ رہا ہے۔

اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں امام کا کردار

امام حسن عسکریؑ نے صرف اٹھائیس برس کی عمر پائی، پھر بھی معارف اسلام کی تبلیغ و ترسیل میں بڑا عظیم الشان نقش چھوڑا ہے۔ ایک طرف تو بڑے بڑے نامور اور ماہر شاگرد تیار کئے اور دوسری طرف جب کہ یونان، ہندوستان اور قدیم ایران کے انحرافی اور انحطاطی افکار و نظریات اسلامی معاشرے میں سرایت کر رہے تھے، امام گذشتہ ائمہ معصومینؑ کی مانند اس انحراف بھرے اور گمراہ کن آراء و عقائد کے مقابلے میں (دیوار بن کر) کھڑے ہو گئے اور فکری و نظریاتی (Ideological) محاذ پر اسلام کی حفاظت فرمائی۔

”اسحاق کندی“ تناقضات قرآن کے سلسلے میں کتاب لکھ رہا تھا۔ امام کو یہ خبر ملی تو آپ مناسب وقت کے انتظار میں رہے۔ ایک دن ”کندی“ کے کچھ شاگرد امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے ان لوگوں سے فرمایا کہ آیات میں کوئی ایسا ہے جو اپنے استاد کو اس بیہودہ فضول کوشش سے باز رکھ سکے؟ اس کے بعد اس سلسلے میں کچھ عمدہ اور لطیف نکات بھی ارشاد فرمائے۔ جب ”کندی“ کے تلامذہ نے وہ نکات استاد کی خدمت میں پیش کئے، تو وہ حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ فکر کس نے بھری ہے؟ آخر کار ان سب نے اعتراف کیا کہ ہمیں یہ باتیں ”ابو محمد“ نے سکھائی ہیں۔ پھر ”کندی“ نے بھی اعتراف کر ہی لیا کہ سوائے خاندان رسالت کے کوئی بھی ان گمراہیوں کو روک نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے قرآن کے خلاف تمام نوٹوں (Notes) اور رجسٹروں کو نذر آتش کر دیا جو قرآن پر اعتراض و تنقید کے سلسلہ میں لکھے تھے۔ یہ واقعہ امام عالی ہمم کے علمی مجاہدوں کا ایک بہترین نمونہ اور اعلیٰ فکری نقش ہے۔

حدیث کے بنیادی ماخذوں میں بہت سی حدیثیں امام حسن عسکریؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے پیغمبر اسلامؐ کی مشہور ترین حدیث کہ ”شرابی، مشرک اور بت پرست کے مثل ہے۔“ امام حسن عسکریؑ ہی کے ذریعہ روایت کی گئی ہے۔ ابن جوزی نے ”تحریم الخمر“ میں نقل کی ہے کہ ابو نعیم فضل بن وقین نے اس حدیث کو اس لئے صحیح بتایا کہ اہلبیتؑ رسول کے توسط سے آئی ہے۔

سمعانی ”کتاب الابصار“ میں لکھتا ہے کہ حافظ واعظ ابو محمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم طوسی بلاذری نے اس حدیث کو امام ابو محمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ الرضا سے سنا ہے۔

امام کے بعض مشہور تلامذہ:

- ۱- ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری، جو امام کے ثواب اور نمائندوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے چار اماموں کا زمانہ دیکھا ہے۔
- ۲- داؤد بن ابی زید نیشاپوری۔
- ۳- ابوطاہر محمد بن علی بن ہلال۔
- ۴- ابو عباس بن جعفر حمیری قمی، جو اپنے زمانے کے بزرگ علماء میں سے تھے۔ ان کی اہم تصنیف ”قرب الاسناد“ ہے جو کتاب کافی کا خاص ماخذ ہے۔
- ۵- محمد بن احمد بن جعفر قمی، آپ بھی امام کے نائین میں سے تھے۔
- ۶- جعفر بن سہیل صیقل۔
- ۷- محمد بن حسن صفرمی، آپ اپنے دور کے صف اول کے علماء میں شمار ہوتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے ان میں سے ”بصائر الدرجات“ مشہور ہے۔
- ۸- ابو جعفر حمانی برکی۔
- ۹- ابراہیم بن ابو حفص ابو اسحاق کاتب۔
- ۱۰- ابراہیم بن مہریار، صاحب ”کتاب البشارات“۔

- ۱۱- احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن داؤد ہمدانی الکاتب الندیم، ادب و فقہ کے بزرگ استاد تھے۔
 - ۱۲- احمد بن اسحاق الاشعری ابو علی القمی، یہ بھی ممتاز علماء میں سے تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے ایک کتاب ”علل الصوم“ ہے۔
- یہ چند نام ان بزرگ علماء کے ہیں جنہوں نے گیارہویں امام کی بارگاہ سے کسب فیض کیا اور علوم اسلامی کی نشر و اشاعت اور عقائد و افکار اسلام کی تعلیم اور مذہبی معاشرے کی فکری رہنمائی کے لئے انتھک کوششیں کی ہیں۔ امام حسن عسکریؑ نے قرآن مجید کی تفسیر کا بھی درس دیا، جس کی بنیاد پر ”ابو علی حسن بن خالد بن محمد بن علی برقی“ نے تفسیر لکھی جو ایک سو بیس (۱۲۰) ابواب پر مشتمل تھی۔
- افسوس کہ آج یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔ لیکن بہت سی روایتیں جو قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر میں معتبر اسلامی کتابوں میں پائی جاتی ہیں اسی کتاب سے اقتباس کی ہوئی ہیں۔
- ”تحف العقول“ میں اسحاق بن اسماعیل الاشعری کے نام امام کا ایک قدرے مفصل رسالہ ہے جس میں امام کے کلمات قصار (اقوال) بھی درج ہیں۔
- ان تمام عظیم علمی اور فکری کارناموں کو امام حسن عسکریؑ نے ۲۸ سال کی مختصر مدت میں انجام دیا جس میں صرف ۶ سال امامت کی ذمہ داری سنبھالی ہے (امام علی نقیؑ کی شہادت کے بعد) اور وہ بھی اس خطرناک ماحول میں اور بادشاہان عباسی کے جور و ستم کے دور میں۔
- ان علمی سرگرمیوں اور فکری رہنمائیوں کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی امام نے کار ہائے نمایاں انجام دیئے جو حقیقی اسلام کے استقرار کی راہ میں نقش دائم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امام کو اپنی قید میں رکھتے ہوئے بھی مطلق العنان حکمران اس قدر خائف تھے کہ امام کی جان کے درپے ہو گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ”حقیقت“ پایہ زنجیر ہو کر بھی باطل کے وجود کے لئے ایک بڑا تازیانہ ہوتی ہے۔ باطل پرستوں کا یہ اصول ہے کہ وہ حقیقت کے ستارے کو غروب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ایک ستارہ غروب ہوتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا طلوع ہو کر پرستار ان شب کو دعوت مبارزہ دیتا ہے اور

ایک شمع سے متعدد شمعیں روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح ارباب حق کے گیارہویں عظیم پیشوا امام حسن عسکریؑ ۲۶۰ھ میں عباسی خلیفہ معتمد کی سازشوں کے سبب زہر دغا سے شہید ہوئے۔ اور اپنی جگہ باطل شکن اور عدل گستر امام مہدیؑ کو چھوڑ گئے تاکہ دیرینہ سنت کے مطابق حق پرستوں کی روایت کو زندہ رکھیں اور بالآخر ایک دن باطل کی بساط کو الٹ کر طاغوتی طاقتوں کا خاتمہ فرما کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ عَلِيٍّ عَلَیْہِ السَّلَام۔

امام زمانہ علی اللہ فرجا الشریف

امام زمانہ اور عقیدہ مہدویت

۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد مشیت خداوندی نے بارہویں امام حضرت مہدیؑ کو پردہ غیبت میں روپوش کر دیا تاکہ مشعل بردار نور، ظلمت کی بے پناہ طاقتوں کی یورش سے محفوظ رہے۔

غیبت امام کے زمانہ کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: غیبت صغریٰ جس کی مدت ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء سے ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء تک ہے اور غیبت کبریٰ جو ۳۲۹ھ مطابق ۹۴۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ غیبت صغریٰ کے دوران امام اپنے نائبوں (نواب اربعہ) کے ذریعہ اپنے پیروکاروں سے رابطہ رکھتے تھے مگر اس کے بعد سے یہ ظاہری رابطہ منقطع ہو گیا اور امام مکمل طور پر پردہ غیبت میں چلے گئے، ایک مناسب مدت تک کے لئے جسے مشیت خداوندی منتخب کرے گی، اس وقت وہ ظہور فرمائیں گے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام مہدیؑ کے ظہور کے ساتھ ہی دنیا میں حکومت عدل و نظام الہی قائم ہو جائے گا اور اسلام کی حقیقی تعلیمات مکمل طور سے رائج ہو جائیں گی۔ ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا کسی کی اتنی طویل عمر بھی ہو سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ائمہ ایسے انسان ہیں جو خداوند عالم کے خصوصی فیض و عنایت کے حامل ہیں۔ وہ انسان بھی ہیں اور خصوصی قوت و اختیارات کے مالک بھی ہیں اور روحانی بلندی کے لحاظ سے معنوی کمال کی چوٹی پر فائز ہیں، اگر خدائے بزرگ کی خاص عنایت کی وجہ سے ان مقدس ہستیوں میں سے کوئی ہستی عام انسانوں کے برخلاف زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہم خداوند تعالیٰ کی ذات، اس کی قدرت اور روحانیت پر اعتقاد رکھیں تو ہمارے لئے اس حقیقت کو سمجھنا زیادہ مشکل

نہیں کہ کوئی انسانِ کامل صدیوں تک موت سے محفوظ رہ سکتا ہے، کیونکہ خداوندِ قدوس جو موت وزیست کے قانون کا بانی ہے، بلا شک کسی کی حیات کو معمول سے زیادہ (اپنی مشیت کے مطابق) طولانی کر دینے پر بھی قادر ہے۔ کسی مسلمان کے لئے بالخصوص اس امر میں کسی شک یا تردد کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ قرآن کی رو سے ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت خضرؑ آج بھی زندہ ہیں اور حضرت نوحؑ نے سینکڑوں سال کی عمر پائی۔

غیبت کے دور میں امام کون سا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ممکن ہے سوال پیدا ہو کہ امام دور غیبت میں کون سا کردار ادا کر رہے ہیں یا کیا ان کی امامت بے کار اور لا حاصل ہے؟ یہ شبہ امامت کی حقیقت اور اس کے فرائض سے ناواقفیت کی پیداوار ہے۔ جیسا کہ بار بار بتایا گیا ہے کہ امام صرف سیاسی، اجتماعی اور فکری رہبری کے فرائض انجام نہیں دیتا بلکہ اہم معنوی، باطنی اور روحانی فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ امام دنیا والوں کے لئے فیضانِ الہی کا ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ جو لوگ انسانی اور معنوی ارتقاء کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں امام ان روحوں کی رہبری کرتا ہے۔ امام کے فرائض محض اجتماعی اور مادی ہی نہیں بلکہ باطنی اور روحانی بھی ہوتے ہیں۔ امام صرف جسم ہی سے نہیں بلکہ روح سے بھی رابطہ رکھتا ہے اور مومنوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ امام کے اس ماورائی اور باطنی پہلو کو اگر مد نظر رکھا جائے تو اس کے ذریعہ ہم غیبت کے زمانے میں امام کے کردار کو سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں بھی باطنی رہبری اور ہدایت کی طرف اشارہ موجود ہے اور الیاسؑ و خضرؑ جیسے انبیاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو باطنی طور پر لوگوں کو نیکی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ امام آفاق باطن میں بھی موجود ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے کہ امام دنیا والوں کے لئے عنایت و فیضانِ ربانی کا وسیلہ ہے۔ خدا نے انسان کو اپنے فنِ تخلیق کے شاہکار کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جس میں بعض ملکوتی

صفات بھی موجود ہوتے ہیں۔ ”خلق اللہ آدم علی صورۃ، لیکن خداوند عالم صرف کامل انسانوں جو پیغمبر اور ائمہ ہوتے ہیں، ان میں اپنی عظمتِ تخلیق کے ہر رخ، ہر پہلو اور ہر خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ائمہ خالق کی خلافت کی عظمت کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک مصور تمام نقش اپنا شاہکار بنانے کے لئے کھینچتا ہے، اسی طرح خالق کائنات نے بھی زمین و آسمان ان ہی مقدس ہستیوں کے لئے خلق کئے ہیں، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ: ”لولاک لما خلقت الافلاک“ یعنی ”اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔“ ایسی صورت میں تمام ائمہ بھی اسی ”حقیقت محمدیؐ“ سے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: ”اولنا محمد و اوسطنا محمد و آخرنا محمد۔“ اس رو سے سارے ائمہ حدیثِ قدسی کے اس جملہ کے مصداق ہیں۔ اس طرح امام کا وجود ہر دور اور ہر زمانہ میں ہستی کی بقا کا سبب اور عنایت و فیض خداوندی کا ذریعہ ہیں۔

امام پردہ غیبت میں بھی وہ خورشید ہیں کہ جس کے گرد زمین، چاند اور ستارے گردش کرتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ تمام موجودات امام کی ذات سے نور ہدایت حاصل کرتے ہیں، اسی وجہ سے امام رضاؑ کی مشہور حدیث میں آیا ہے کہ: ”الامام كالشمس الطالعة المجللة بنورھا العالم وهو بالافق حیث لا ینالہ الابصار ولا الایدی۔“ یعنی ”امام خورشید درخشاں کی طرح ہے جو تمام جہاں کو منور کرتا ہے اور وہ ان آفاق پر جلوہ گر ہوتا ہے جہاں نہ نظر اسے پاسکتی ہے، نہ حواسِ خمسہ اسے چھو سکتے ہیں۔“

فلسفہ غیبت

فلسفہ مہدویت کیا ہے؟ فلسفہ مہدویت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اسلامی نقطہ نظر سے فلسفہ تاریخ اور جہاں بینی کے مسائل سے آشنا ہوں۔ تاریخ کی ترقی پذیری اور دنیا میں انسانی زندگی کی آزمائشی کیفیت اور انسان کے انتخاب اور آزاد ارادہ کے مالک ہونے کے متعلق

اسلامی نکتہ نظر کی روشنی میں ہم انبیاء کی بعثت، حضرت محمد مصطفیٰ کی بعثت اور ختم نبوت کا فلسفہ اور بارہ اماموں کے مقرر ہونے کی حکمت اور حضرت مہدی کی غیبت اور دوبارہ ظہور کے فلسفہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے خدا نے انسان کو ایسے موجود کے طور پر بنایا ہے جو اشرف المخلوقات ہے اور ”ارادہ“، ”تعلقل“، ”ایمان“ اور ”اشراق“ یعنی الہام کی خصوصیتوں کا مالک ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ”ارادہ“ کی آزادی اور انتخاب کی توانائی سے نوازا ہے، جو ایک طرف تو خدا کی عظیم عنایت ہیں مگر دوسری طرف ایسی بڑی ذمہ داری دی جسے قبول کرنے سے پہاڑوں، زمین اور آسمان نے انکار کر دیا تھا۔ اگر ارادہ کی آزادی اور انتخاب کی توانائی نہ ہو تو انسان جانور اور چوپایوں سے بھی نیچے گر جائے۔

مگر انتخاب اس وقت کارآمد ہوتا ہے جب راہ راست واضح ہوتی ہے۔ خداوند عالم کی عنایت اس کے وجود کا لازمہ ہے۔ اس نے ”نبوت“ کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کے لئے نیز انسان کی سعادت اور نجات کے ذرائع فراہم کرنے کے لئے ہی قائم کیا۔ انسان کی روحانی اور فکری نشوونما کے لئے یکے بعد دیگرے پیغمبر مبعوث ہوئے اور مختلف رخنوں سے حقیقت کی رونمائی کی، یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کی بعثت اور نزول قرآن کے ساتھ ہی بندوں تک ”حقیقت“ اور ”پیغام“ مکمل طور پر پہنچ گئے، دین کی تکمیل ہو گئی، اس کے حدود اور اصلی خطوط متعین ہو گئے۔ چونکہ ”پیغام“ پہنچانے کا کام مکمل ہو چکا تھا لہذا حضرت محمدؐ کے ساتھ ہی بعثت انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور حضرت خاتم الانبیاء کی رسالت ہر زمانے کے لئے لازمی طور پر قابل اتباع ہو گئی اور اس کے بعد سے قیامت تک تمام انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبر اسلام کی پیروی کریں۔

اس کے بعد شرح و تفسیر اور اجرا و نفاذ کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ قرآن میں ”پیغام“ یکجا پہنچ گیا مگر عام انسانوں کے لئے کلام الہی کے رموز کا عرفان ممکن نہ تھا لہذا ضرورت تھی ایسے خدائی افراد اور کامل انسانوں کی جو ایک طرف تو حدیثوں کے ذریعہ پیغام قرآنی کے تمام گوشوں اور باریکیوں کی تفسیر و تشریح اور سیرت پیغمبرؐ کی تفصیل پیش کریں دوسری طرف عملی طور پر درس دیں کہ

مختلف حالات میں انسان کس طرح کی وضع رکھے۔ دوسرے معنوں میں قرآن کے ساتھ ساتھ ایسے انسانوں کی ضرورت تھی جو انسانیت کے لئے ”اسوۂ جاوید“ اور عملی نمونہ ہوں۔ اسی وجہ سے خدا نے ”امامت“ کا سلسلہ قائم کیا۔

لیکن انسانوں کی تربیت (نبوت عامہ) اور خدائی ”پیغام“ پورے طور پر پہنچ جانے کے بعد (نبوت خاصہ) جب معلمان الہیہ اور رہبروں نے اس کی تشریح کر دی (منصب امامت) تو مشیت خداوندی کا رخ اس طرف ہوا کہ ایک امام کو پردہ غیبت میں روپوش کر دے تاکہ پیغمبروں اور سابقہ اماموں کی تعلیمات کی روشنی میں اور اپنی عقل کی مدد اور فکری توانائی کے ذریعہ اپنے اجتہاد کو صحیح طور پر پورا کریں۔ غیبت کے بعد کا دور ”اجتہاد“ کا دور ہے۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے علم اور اپنی عقل کا صحیح استعمال کریں تاکہ وحی اور سیرت پیغمبر و ائمہ کی ہدایت سے اپنے مسائل کے حل کے سلسلہ میں فائدہ حاصل کریں۔ بالآخر مشیت الہی دوبارہ امام کو پردہ غیبت سے ظاہر کرے گی تاکہ دنیا میں آئیڈیل معاشرہ اور مثالی نظام قائم ہو۔ انسان دور غیبت میں ایک امتحانی اور آزمائشی مرحلہ سے دوچار ہے، اس کے بعد خدائی معلم دوبارہ ظاہر ہوگا اور صحیح کو غلط سے اور حق کو باطل سے الگ کر دے گا۔

ہم اس ہدایت کے پورے خدائی انتظام کو ایک اسکول سے تشبیہ دے سکتے ہیں، گویا پہلے مختلف درجوں کی سلسلہ وار تعلیم مکمل کرائی گئی (بعثت انبیاء) اور تحریری رہنمائی بھیجی گئی (وحی) آخری (Final) درجہ کی نظریاتی تعلیم دی گئی (پیغمبر اسلام کی بعثت) پھر گیارہ اماموں نے اس تعلیم کو عملی طور پر برت کر دکھایا۔ (امامت کا دور)۔ اس کے بعد معلم کو غیبت کے پردے میں چھپا لیا گیا اور طالب علموں کو چھوڑ دیا گیا کہ (عقل و خرد اور استعداد کے بل بوتے پر) امتحان دیں (غیبت کا زمانہ)۔ اس کے بعد معلم دوبارہ ظاہر ہوں گے اور صحیح جوابات عملی طور پر چیک کر کے نمبر دیں گے (ظہور)۔ اس مثال کے ذریعہ ہم غیبت کے فلسفہ کو کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

تاریخ ترجمہ اسوہ ہائے جاوید

(نگاشتہ پروفیسر ڈاکٹر مولانا سید علی محمد نقوی صاحب دام فیوضہ)

از ادیبہ فاضلہ سیدہ بنت زہرا نقویہ ندی آلہندی زادو فیقاتہا

دیکھئے ذہن و عمل کی عصمتیں

چودہ معصوموں کی زندہ سیرتیں

دیکھئے کردار کی اونچائیاں دیکھئے انسانیت کی رفعتیں
یہ جلالت کے نمونے، اوج بخش یہ فروغ بندگی کی شوکتیں
زندہ و تابندہ جلوہ زار ہیں فخر انساں کے لئے یہ دولتیں
قابل تقلید ہیں یہ سیرتیں جاذب قلب و نظر یہ صورتیں
ہے قلم بھی ان کے آگے سجدہ ریز
ان سے ہیں تحریر میں سب وقعتیں

چھپ چکی ہے 'اسوہ ہائے جاوید' ایک فاضل کی یہ فکری جودتیں
وہ علیؑ کا اور محمدؐ کا سہی ہیں جلی اس کے قلم کی عزتیں
وہ مصنف، وہ محقق، ذی ذکا گھیرے ہیں اس کو بہت سی شہرتیں
فارسی تالیف کو اردو میں بھی کر گئیں اک فاضلہ کی محنتیں
دیکھیں اردو ترجمہ بھی اہل ذوق یہ ندی آلہندی کی قلمی ہیبتیں
بنت زہرا وہ ادیبہ پاکزاد بڑھتی جائیں اس کی فکری طاقتیں

وقت بھی تائید میں کہتا ہے یہ

لیجئے زندہ مثالی سیرتیں

۳۳۰ھ